مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل

آغاز	عرضِ ناشر
باب اوّل	ہیں آج کیوں ذلیل؟
باب دوم	قرآن کا قانونِ عذاب
باب سوم	سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں اور سابقہ امت کی دو ہزار سالہ تاریخ کے چار ادوار
باب چہارم	موجودہ اُمت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے چار ادوار
باب پنجم	بیسویں صدی عیسوی ــــــ سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں
باب ششم	ابراہیمی مذاہب کا ''تالث ثلاثہ''
باب ہفتم	''آنے والے دور'' کی ایک واضح تصویر
باب ہشتم	اسلام کا عالمی غلبہ یا عالمی نظامِ خلافت
باب نہم	اب تک کے مباحث کا خلاصہ
باب دہم	پندرھویں صدی ہجری: توقعات اور اندیشے
باب یازدہم	دو شبہات اور ان کے جواب
باب دوازدہم	خلیج کی جنگ: ''جنگوں کی ماں''؟
باب سیزدہم	ملت اسلامیہ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری
باب چہاردہم	پاکستان کا مستقبل
باب پانزدہم	ہماری نجات کا واحد ذریعہ: اجتماعی توبہ
ضمیمہ	اس کتاب میں مذکور احادیث کی تخریج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

زیرِنظر کتاب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اپریل ۹۳ء سے جولائی ۹۳ء کے دوران ''تفکر و تذکر'' کے زیرِعنوان ''نوائے وقت'' میں شائع ہوئے۔ اُمت کی زبوں حالی پر ہر درد مند رکھنے والے مسلمان کے دل میں پیدا ہونے والی اس خلش کہ ''ہیں آج کیوں ذلیل.....؟'' کے تذکرے سے شروع ہونے والے یہ مضامین دراصل محترم ڈاکٹر صاحب کے خطبہ عیدالفطر کی تفصیل و تشریح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سال یہ خطبہ غیر معمولی طور پر طویل ہی نہیں، غیر معمولی اہمیت کا حامل بھی تھا اور اس کا عنوان تھا: ''امتِ مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے سائے، مسیح دجال کی آمد آمد اور مسلمانانِ پاکستان کی ذِمہ داریاں!'' ——— عیدالفطر سے متصلاً قبل محترم ڈاکٹر صاحب بیرونِ ملک سفر سے واپس تشریف لائے تھے اور ان کے اس سفر میں امریکہ، فرانس اور سعودی عرب کے ساتھ ساتھ متحدہ عرب امارات کا مختصر دورہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ اس سفر کے مشاہدات و تاثرات کا ایک عکس بھی ان کی زیرِنظر تقریر و تحریر میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

بین الاقوامی حالات جس تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں اور تاریخ جس برق رفتاری سے کروٹیں بدلنے لگی ہے، اس کے پیشِ نظر ملک و ملت کا درد رکھنے والا ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اُمتِ مسلمہ اور اسلام کا مستقبل کیا ہوگا! بادی النظر میں تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ اسلام مخالف تمام قوتیں اب واحد سپر پاور امریکہ جسے ایک اعتبار سے ''سپریم پاور'' کہنا بھی غلط نہ ہوگا، کے جھنڈے تلے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف متحد ہو چکی ہیں، اور ستم ظریفی یہ کہ قوت و طاقت کے نشے میں سرشار اس سپر پاور کے سر پر ''یہودی'' سوار ہے جس کی مسلمان دشمنی محتاجِ بیان نہیں۔ اس تناظر میں صاف نظر آتا ہے کہ اُمت کا مستقبل نہایت تاریک ہے اور شدید اندیشہ ہے کہ دجالی فتنے کا یہ سیلاب مسلمانوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ لیکن ہمارے لیے اصل غور طلب بات یہ ہے کہ کیا اس تاریکی کے بعد کسی روشن صبح کے نمودار ہونے کا امکان ہے یا نہیں؟ کیا یہ شب تاریک کبھی جلوۂ خورشید سے گریزاں ہو سکے گی اور کیا کرۂ ارضی ایک بار پھر نغمۂ توحید سے معمور ہو سکے گا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا ہمارے لیے یہ طرزِ عمل کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہیں کسی طور مناسب ہے؟ یا موجودہ حالات اور مستقبل کے حوالے سے ہم پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے؟ ان سوالات کا بڑا مفصل جواب محترم ڈاکٹر صاحب کی ان تحریروں میں موجود ہے۔ یہ مضامین دراصل سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں، یعنی یہود اور اُمتِ مسلمہ کے ماضی، حال اور مستقبل کے ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحب کے افکار پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ ان کے آئینۂ افکار میں، جو قرآن و حدیث کے نصوص پر مشتمل ہے، قارئین کو نہ صرف یہ کہ ماضی اور حال کا صحیح شعور و ادراک حاصل ہوتا ہے، بلکہ آنے والے دور کی ایک واضح تصویر بھی نظر آتی ہے۔ قارئین محسوس کریں گے کہ فکری و نظری گہرائی کے حامل ان مضامین میں جہاں جابجا دقیق عالمانہ نکات موجود ہیں وہاں عملی رہنمائی کا بھی وافر سامان موجود ہے۔

اس کتاب میں شامل بعض مباحث اس سے قبل ''تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر'' نامی کتابچے میں بھی شامل تھے، لیکن اس کتاب کے مخصوص سیاق و سباق میں ان کا شائع کرنا ضروری تھا۔ ویسے بھی اُس تحریر اور اس زیرِنظر کتاب کے درمیان کم و بیش بیس سال کا فصل ہے، چنانچہ اس طویل فصل زمانی کے پیشِ نظر ان میں بعض نئے پہلو بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو یقیناً قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

ناظم مکتبہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

ہیں آج کیوں ذلیل؟

۲۲ جنوری ۹۳ء کو نیوجرسی سٹیٹ کے صنعتی شہر ٹرینٹن میں خطابِ جمعہ کے لیے ذہن تانا بانا بننے میں مصروف تھا کہ اچانک بجلی کوندنے کے سے انداز میں یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ ہم سورۃ البقرہ کی آیت ۶۱ میں وارد شدہ الفاظ ''ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ'' یعنی ''ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی، اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!'' کو پڑھتے ہوئے اطمینان سے گزر جاتے ہیں، اس لیے کہ یہ الفاظ یہودیوں کے بارے میں وارد ہوئے ہیں، لیکن اگر موجودہ حالات کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو اس وقت ان الفاظِ قرآنی کے مصداقِ کامل مسلمان ہیں نہ کہ یہود! (واضح رہے کہ ذرا سی تقدیم و تاخیر کے ساتھ یہ مضمون سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۲ میں بھی وارد ہوا ہے)[ا] اسی طرح سورۃ الفاتحہ کی آخری آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس امر پر مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ ''مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' کی عملی تفسیر یہود ہیں اور ''ضَآلِّيْن'' کے مصداق نصاریٰ ہیں، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ مؤخر الذکر یعنی عیسائیوں کا گمراہ ہونا تو یقیناً اب بھی صدفی درست ہے، لیکن ''مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' کی عملی تفسیر تو اس وقت یہود نہیں، مسلمان ہیں۔

ا ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾

ذرا غور فرمائیے کہ یہودی اِس وقت پوری دنیا میں کل چودہ ملین یعنی لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ ہیں، جب کہ مسلمانوں کی تعداد کم از کم تیرہ سو ملین یعنی ایک ارب تیس کروڑ ہے۔ گویا مسلمان یہودیوں سے تعداد میں تقریباً سو گنا زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود اس وقت کرۂ ارضی کی سیاسی قسمت بالفعل یہود کے ہاتھ میں ہے، اس لیے وہ علامہ اقبال کے قول ع ''فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' کے مصداق وقت کی ''واحد سپریم پاور'' یعنی ریاست ہائے امریکہ کی سیاست، معیشت اور ثقافت، سب پر پوری طرح قابض اور قابو یافتہ ہیں اور امریکہ کا صدر ہو یا سینٹ، اور کانگریس ہو یا پینٹا گون، سب ان کے اثر و رسوخ اور بالخصوص ذرائع ابلاغ پر ان کے کنٹرول کے آگے بے بس ہیں۔ دوسری طرف سونے چاندی کی بجائے کاغذی کرنسی کے رواج اور بینک، انشورنس اور اسٹاک ایکسچینج کے شیطانی جال پر تسلط کے ذریعے اس وقت دنیا کی دولت کے بڑے حصے پر یہود کا قبضہ ہے۔ چنانچہ ایک جانب ان میں سے بیسیوں افراد ایسے موجود ہیں جو کئی کئی بلین ڈالر کا ایک ایک چیک جاری کر سکتے ہیں، تو دوسری جانب عالمی اقتصادیات کا لیور یا ہینڈل ان کے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں مالی بحران پیدا کر کے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو ریزہ ریزہ کر دیں۔ (سوویت یونین کا یہ حشر تو سامنے کی بات ہے ہی، جیسے ہی صیہونیوں نے محسوس کیا کہ امریکہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے، وہ آناً فاناً یہی معاملہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں، اور غالباً وہ وقت اب زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ واللہ اعلم!)

یہود کا یہ سیاسی اور معاشی اثر و نفوذ تو ذرا پس پردہ اور عام لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے، لیکن اُمت مسلمہ سے تقابل کے اعتبار سے یہ حقیقت تو اظہر من الشّمس ہی ہے کہ عالم اسلام، خصوصاً عالم عرب کے سینے میں اسرائیل کا خنجر بالفعل پیوست ہے۔ (واضح رہے کہ دریائے اردن کے مغربی کنارے، گولان کی سطح مرتفع اور غزہ کی پٹی سے قطع نظر، جس پر ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل قابض ہوا، ۱۹۴۸ء میں جو ابتدائی اسرائیل وجود میں آیا تھا اس کی صورت واقعتاً بالکل خنجر کی سی ہے!) اس پر مستزاد یہ کہ دیکھنے والی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ ''وسیع تر اسرائیل'' بھی بالقوہ وجود میں آ چکا ہے، اس لیے کہ دنیائے اسلام بالخصوص عالم عرب میں کوئی طاقت ایسی موجود نہیں ہے جو اس کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو سکے! (یہ بالکل دوسری بات ہے کہ صہیونیوں کی اپنی حکمت عملی ابھی اپنے آخری اقدام کے ضمن میں قدرے تاخیر کی متقاضی ہو!)۔

اس کے بالکل برعکس صورت حال مسلمانوں کی ہے کہ تعداد میں سوا ارب سے زائد ہونے کے باوجود ع ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی'' کے مصداق بین الاقوامی سطح پر ان کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ سارے عالمی معاملات G-7 یا زیادہ سے زیادہ G-15 طے کرتے ہیں، اور بین الاقوامی مسائل میں سارے اقدامات کا فیصلہ یو این او اور اس کی سیکیورٹی کونسل کے پردے میں صرف امریکہ اور اس کے چند حواری (بالخصوص انگلستان اور فرانس) کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے ملکوں اور بڑی شان و شوکت کی حامل حکومتوں کے جملہ معاملات بھی کہیں اور طے ہوتے ہیں، ہماری داخلی اور خارجی حکمت عملی کہیں اور بنتی ہے، یہاں تک کہ ملکی بجٹ اور ٹیکسوں کے ضمن میں ''ہدایات'' باہر سے آتی ہیں، مزید برآں ہمارے وسائل پر بالفعل اغیار کا قبضہ ہے اور ہمارے دولت مندترین ملکوں کی تمام تر دولت بھی اصلاً غیروں کے دست اختیار میں ہے کہ اگر ذرا ان کی مرضی کے خلاف ادنیٰ جنبش بھی کریں تو چشم زدن میں ان کی کل دولت اور سرمایہ ''منجمد'' کر کے گویا صفر بنا کر رکھ دیں۔ الغرض ہماری کیفیت اس وقت بالکل وہی ہے جس کا نقشہ نبی اکرمؐ نے اپنی ایک حدیث مبارک (رواہ احمدؒ اور ابوداؤدؒ عن

ثوبانؓ) میں کھینچا تھا کہ ''مجھے اندیشہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ نہایت کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود تمہاری حیثیت سیلاب کے ریلے کے اوپر کے جھاگ سے زیادہ نہیں رہے گی۔''[1]

[1] عن ثوبانؓ قال: قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم: يوشك الامم ان تَداعٰى عليكم كما تَداعٰى الاكَلَةُ الى قصعَتِها فقال قائل: مِنْ قِلَّةٍ نحن يومئذ؟ قال: بل انتم يومئذ كثيرٌ ولكنّكم غثاءٌ كغثاء لسيلٌ ولينز عن الله من صدور عدوّكم المهابة منكم، وليقذفن فى قلوبكم الوهن، قيل: وما الوهن يا رسول اللّٰهِ؟ قال: حبّ الدنيا و كراهية الموت (رواه ابوداوٗد)

ترجمہ: ''حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قریب ہے کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دیں گی جیسا کہ کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں۔'' اس پر کسی نے کہا: ''کیا اُس روز ہم تعداد میں کم ہوں گے؟'' آپؐ نے فرمایا: ''تعداد میں تو اُس روز تم بہت زیادہ ہوگی، لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہوگی، جیسا کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کی دلوں سے تمہاری ہیبت نکال باہر کرے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) ڈال دے گا۔'' پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! وہن کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت!''

ان ''لطیف'' حقائق پر مستزاد یہ تلخ واقعات تو نگاہوں کے عین سامنے موجود ہیں کہ مغرب ہو یا مشرق، اس وقت ساری دنیا میں مسلمان شدید ترین مصائب و آلام سے دوچار ہیں۔ چنانچہ مشرق میں بھارت اور کشمیر، اور مغرب میں بوسنیا ہرزیگووینا تو بالفعل ع ''ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو'' کا نقشہ پیش کر رہی ہے، باقی عالم اسلام بھی یا افغانستان اور تاجکستان کی طرح خانہ جنگی کے عذاب میں مبتلا ہے یا سورۃ النحل کی آیت ۱۱۲ میں واردشدہ الفاظ ''لِبَاسَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ'' کے مطابق بھوک اور خوف کے لباس میں ملبوس نظر آتا ہے، اور جہاں بظاہر ان دونوں میں سے کوئی صورت موجود نہیں ہے، بلکہ دولت کی ریل پیل اور عمارتوں کی شان و شوکت یورپ ہی نہیں امریکہ کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے وہاں بھی ''ذلت و مسکنت'' کی یہ صورت بتمام و کمال موجود ہے کہ بین الاقوامی سطح پر نہ عزت ہے نہ وقار، اور خود داخلی سطح پر بھی حقیقی آزادی حاصل ہے نہ واقعی اختیار۔ چنانچہ ایک جانب ''ذلت'' کی انتہا یہ ہے کہ مغرب کے اخبارات و جرائد میں ان دولت مندترین مسلمانوں کا تذکرہ بالعموم تمسخر اور استہزاء کے ساتھ ہوتا ہے، تو دوسری جانب ''مسکنت'' اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ بھارت میں بابری مسجد کے گرائے جانے پر پچاس سے زائد نام نہاد مسلمان حکومتوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ بھارت کی حکومت سے یہ ہی کہہ سکتی کہ اگر مسجد فی الفور دوبارہ تعمیر نہ کی گئی تو ہم سفارتی یا اس سے بھی کم تر درجہ میں تجارتی تعلقات منقطع کر لیں گے۔ گویا عزت و وقار کے ساتھ ساتھ غیرت ملی کا جنازہ بھی نکل چکا ہے اور سوا ارب سے زیادہ افراد پر مشتمل عالمی ملت اسلامیہ اس وقت بالفعل ع ''حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے'' کا نقشہ پیش کر رہی ہے، تو سوچئے کہ الفاظ قرآنی ''ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ'' یعنی ''ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے'' کے مصداق اِس وقت ہم نام نہاد مسلمان ہیں یا یہود؟

آگے بڑھنے سے قبل اس خیال کے تحت مبادا مایوسی اور بددلی کے سائے زیادہ گہرے ہو جائیں، اور مبادا کسی کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو جائے کہ قرآن کے بیان میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے، یہ حقیقت بیان کر دینی ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال مستقل نہیں عارضی ہے، اور مستقبل میں بالکل برعکس ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں قوموں اور اُمتوں کے عروج و زوال کے جو اصول اور عذابِ الٰہی کا جو فلسفہ بیان ہوا ہے اور اس پر مستزاد احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں قربِ قیامت کے جو حالات و واقعات اور یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے مابین آخری آویزش اور معرکہ آرائی کے ضمن میں جو پیشین گوئیاں وارد ہوئی ہیں ان کے مطابق یہود پر بہت جلد ''عذابِ استیصال'' یعنی جڑ سے اکھیڑ پھینکنے والا عذاب نازل ہوگا (اس اصطلاح کی وضاحت بعد میں ہوگی)، اور وہ ''عظیم تر اسرائیل'' جس کے خواب وہ عرصے سے دیکھ رہے ہیں اگرچہ ایک بار قائم تو ہو جائے گا لیکن بالآخر وہی ان کا عظیم تر اجتماعی قبرستان بنے گا۔ دوسری جانب پورے کرۂ ارضی پر بالآخر اُمت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حکومت قائم ہوگی اور اللہ کے دین کا بول بالا ہوگا۔ گویا موجودہ نیو ورلڈ آرڈر جو درحقیقت جیو ورلڈ آرڈر (یعنی یہودیوں کی بالادستی کا عالمی نظام) ہے بالآخر اسلام کے ''جسٹ ورلڈ آرڈر'' (Just World Order) یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوت کے عدل و قسط پر مبنی عالمی نظام میں تبدیل ہو کر رہے گا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِىَ الْاَرْضَ فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا، وَاِنَّ اُمَّتِىْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِىَ لِىْ مِنْهَا))

''اللہ نے مجھے پوری زمین کو لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھا دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی۔ اور یقین رکھو کہ میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھائے گئے۔''

اسی طرح مسند احمدؒ بن حنبل میں حضرت مقداد بن الاسواض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَذُلِّ ذَلِیْلٍ، اِمَّا یُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَیَجْعَلُهُمْ مِّنْ اَهْلِهَا اَوْ یُذِلُّهُمْ فَیَدِیْنُوْنَ لَهَا))

’’دنیا میں نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا، خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کیمغلوبیت کی صورت میں۔ یعنی یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی تابعداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔‘‘

لٰہذا ہم الصادق والمصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات پر یقین کی بناء پر ایک جانب موجودہ عالمی نظام کے سربراہوں، یعنی یہود و نصاریٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ

’’اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!‘‘

اور دوسری جانب معروضی حالات کے مطالعے اور مشاہدے کے باعث جب اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا محسوس ہو اور مایوسی کے سائے زیادہ گہرے ہونے لگیں تو

’’سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!‘‘

اور

’’نہ ہو نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امید مردِ مؤمن ہے خدا کے راز دانوں میں!‘‘

کے مصداق ’’دامانِ خیال یار‘‘ کی طرح دامن امید پر اپنی گرفت از سرِ نو مضبوط کر سکتے ہیں..... لیکن علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ

’’مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار!‘‘

اس آخری اُمید سے اپنے سینے کو آباد رکھنے کے ساتھ ساتھ دو اسباب کی بناء پر لازم ہے کہ ہم ان سوالات کے جواب قرآن کے فلسفہ و حکمت کی روشنی میں تلاش کریں کہ اس وقت

’’ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں!‘‘

کے مصداق کامل، ہم مسلمان ہی کیوں بن گئے ہیں اور اس کا کیا سبب ہے کہ

’’رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!‘‘

اس لیے کہ ایک عام سادہ لوح مسلمان کی سوچ تو لامحالہ یہ ہے کہ ہم خواہ افعال و اعمال اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے کتنی ہی پستی میں گر چکے ہوں، بہر حال کلمہ گو اور خاتم النبیین اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں اور ’’توحید کی امانت‘‘ کے حامل اور ع ’’ہر کہ عشق مصطفیٰ ؐ سامان اوست‘‘ کے کسی نہ کسی درجے میں مدعی ہیں۔ جبکہ یہود و نصاریٰ اور بقیہ جملہ اقوامِ عالم کھلم کھلا کافر و مشرک اور اللہ اور رسول کی صاف منکر و مخالف ہیں، اور قرآن مجید میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ ’’اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

ان سوالات پر قرآن وحدیث کی روشنی میں سنجیدگی سے غور ان اسباب کی بناء پر لازمی ہے کہ:

۱) جیسے قرآنِ مجید میں بار بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا گیا کہ ''لوگو! جس بات کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے یا جس عذاب کی وعید سنائی جا رہی ہے، میں نہیں جانتا کہ وہ قریب ہے یا ابھی کچھ دور ہے''۔ (جیسے مثلاً سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۹ میں اور سورۃ الجن کی آیت ۲۵ میں) اسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ عذاب استیصال کے ذریعے یہود کے خاتمے اور عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے غلبے کا ''انقلاب عظیم'' قریب آ چکا ہے یا ابھی کچھ دیر تک موجودہ صورت ہی برقرار رہے گی۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چونکہ احادیث نبویہ علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسلام ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ع ''اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا'' کے مصداق ابھی موجودہ صورتِ حال مزید گھمبیر ہوگی اور امت مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے مزید اور شدید تر کوڑے برسیں گے، لہٰذا ضروری ہے کہ موجودہ صورتِ حال کے اسباب اور قرآن کے فلسفۂ عذاب کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، تاکہ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ ﴿وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ یعنی ''اور جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث ہوتی ہے، اور اللہ بہت سی کوتاہیوں سے تو درگزر بھی کرتا رہتا ہے!'' کے مطابق یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ یہ حالات و کیفیات ع ''اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!'' کے مصداق ہماری اپنی بے عملی ہی نہیں بداعمالی کا نتیجہ ہیں تاکہ نہ ہم ''ظَآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ'' (الفتح:۶) یعنی اللہ سے بدظنی کرنے والوں کے زمرے میں شامل ہوں نہ ہمارے دلوں میں اللہ سے کوئی شکوہ شکایت پیدا ہو، بلکہ اپنی خطاؤں کے اعتراف کے ساتھ حقیقی پشیمانی اور خشوع وخضوع اور تضرع واخبات کی کیفیات پیدا ہوں جو توبہ کی لازمی شرائط ہیں!

۲) جیسے ہر جسمانی عارضے کے صحیح علاج کے لیے مرض کی صحیح تشخیص لازمی ہے، اسی طرح ضروری ہے کہ امت کی موجودہ زبوں حالی کے اصل اسباب کا صحیح تعین کیا جائے تاکہ ہماری قوتیں اور توانائیاں اور وقت کی قیمتی متاع سطحی قسم کی تدابیر میں ضائع نہ ہو جائیں، بلکہ ہم صورت حال کی سنگینی کے صحیح ادراک اور امت کے مزمن اور پیچیدہ امراض کے گہرے اسباب وعوامل کا صحیح شعور حاصل کر کے ان کے مداوا اور معالجہ کے لیے صحیح اور مؤثر تدابیر اختیار کر سکیں، اور اس تلخ حقیقت کے اعتراف کے ساتھ کہ اس وقت ہم بحیثیت اُمت عذابِ الٰہی کی گرفت میں ہیں اس سے رستگاری کے حصول اور اللہ کے عفو ومغفرت کے دامن میں آنے کے لیے صحیح طریق کار پر عمل پیرا ہو سکیں _____ لہٰذا ان شاء اللہ العزیز آئندہ سطور میں ''قرآن کے فلسفۂ عذاب'' پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ گفتگو ہوگی۔

۱۲/اپریل ۱۹۹۳ء

باب دوم

قرآن کا قانونِ عذاب

ہمارا ایمان ہے کہ اس کائنات میں ایک پتہ بھی اللہ کے اذن کے بغیر جنبش نہیں کرسکتا۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی پورے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے ان اٹل قوانین اور قواعد وضوابط یعنی قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں اللہ کی اس ''سنت'' کے تحت ہوتا ہے جس میں کوئی تغیر وتبدل ممکن نہیں۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۲ میں کہ:

﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۝﴾

''تم ہرگز نہ پاؤ گے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی!''

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ فاطر کی آیت ۴۳ اور سورۃ الفتح کی آیت ۲۳ میں بھی وارد ہوا ہے...... لہٰذا اگر آج پوری دنیا میں مسلمان شدید مصائب اور آلام سے دوچار ہیں تو یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کے کسی قانون یعنی اس کی اٹل اور مستقل سنت کے تحت ہورہا ہے۔ اور اگر ہم دل سے چاہتے ہیں کہ یہ صورتِ حال تبدیل ہو تو لازم ہے کہ قرآن حکیم پر تدبر اور تفکر کے ذریعے اللہ کے قانونِ عذاب کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس لیے کہ اسی پر اصلاحِ احوال کی صحیح اور مؤثر تدابیر کے فہم وشعور کا انحصار اور دارومدار ہے۔

قرآنِ حکیم کے عام اسلوب کے مطابق اس کا ''قانونِ عذاب'' بھی کہیں پورے کا پورا یکجا بیان نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کی مختلف دفعات متفرق طور پر مختلف مقامات پر وارد ہوئی ہیں اور اگر ان سب کو جمع اور مرتب کرکے ان کی پشت پر کارفرما حکمت سمیت بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ:

۱) یہ دنیا بنیادی طور پر دارالعذاب نہیں دارالامتحان ہے، اور جزا وسزا کا معاملہ اصلاً دنیا سے نہیں آخرت سے متعلق ہے۔ چنانچہ اس حیاتِ انسانی میں سے جو، علامہ اقبال کے اس قول کے مطابق کہ ؎

''تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!''

اتنی طویل ہے کہ دنوں، مہینوں اور سالوں کیا صدیوں میں بھی نہیں ناپی جاسکتی، موت کا ایک وقفہ ڈال کر (؎ ''موت اک زندگی کا وقفہ ہے۔ یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!'') جو نہایت مختصر اور حقیر سا حصہ ''حیاتِ دنیوی'' کی صورت میں علیحدہ کرلیا گیا ہے، اس کی اصل غرض وغایت آزمائش اور امتحان وابتلاء ہے۔ جیسے کہ فرمایا گیا سورۃ الملک کی آیت ۲ میں کہ:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط﴾

''اس نے بنائی موت اور زندگی تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا۔''

جس کی بہترین ترجمانی کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ: ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس امتحان میں انسان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا، جہاں اگرچہ اس غرض کے لیے قوموں اور اُمتوں کی اجتماعی پیشی بھی ہوگی کہ ان کی جانب مبعوث کئے جانے والے رسول استغاثے کے گواہوں کی حیثیت سے ان پر حجت قائم کرسکیں کہ ہم نے تو تمہیں اللہ کا پیغام پہنچانے کا حق ادا کردیا تھا، اب اپنے طرزِ عمل کے لیے تم خود جوابدہ ہو، تاہم اصل محاسبہ ہر انسان کا خالص انفرادی حیثیت پر ہوگا جیسے کہ فرمایا سورۂ مریم کی آیت ۹۵ میں کہ:

﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا۝﴾

''ان میں سے ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے حضور میں پیش ہوگا فرداً فرداً یعنی اکیلا اکیلا۔''

گویا انفرادی سطح پر کسی انسان پر جو مصیبتیں حیاتِ دنیوی کے دوران نازل ہوتی ہیں وہ امتحان اور آزمائش کی غرض سے ہوتی ہیں، عذاب یا سزا کے طور نہیں۔ اس قاعدۂ کلیہ میں صرف ایک استثناء، جو بعض احادیث نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک اور مقبول بندے کو دنیا میں کسی تکلیف میں اس لیے مبتلا کر دیتا ہے کہ اسے اس کی کسی خطا کا کفارہ بنادے، تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائے۔ تاہم منطق کے عام قاعدے کے مطابق اس استثناء سے قاعدۂ کلیہ ختم نہیں ہوتا۔

۲)	البتہ اس قاعدۂ کلیہ کا کامل اطلاق صرف افراد پر انفرادی حیثیت سے ہوتا ہے۔ قوموں اور اُمتوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی اجتماعی غلط روی اور مجموعی بداعمالی کی سزا اکثر و بیشتر اس دنیا میں دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ بالکل صحیح فرمایا ہے علامہ اقبال نے کہ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

اور قوموں اور اُمتوں پر وارد ہونے والے اس اجتماعی عذاب کا تلخ ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے، یعنی گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ بے گناہ بھی عذاب کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ میں کہ:

﴿وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ۝﴾

''اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو لاحق نہیں ہوگا، اور جان رکھو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

اگرچہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ایک استثناء کی اُمید دلائی ہے، یعنی یہ کہ کسی قوم یا امت پر وارد ہونے والے اجتماعی عذاب سے ان لوگوں کے بچنے کی امید کی جا سکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ خود بدی سے اجتناب کرتے رہیں، بلکہ اپنی قوم کو غلط روش اور اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے روکنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں، جیسے کہ سورۃ الاعراف میں اصحاب السبت پر نازل ہونے والے عذاب کے ضمن میں فرمایا:

﴿اَنۡجَيۡنَا الَّذِيۡنَ يَنۡهَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ﴾ (آیت: ۱۶۵)

''اور ہم نے بچا لیا ان لوگوں کو جو بدی سے روکتے رہے تھے۔''

۳)	قوموں اور اُمتوں پر دنیا میں نازل ہونے والے عذاب کی بدترین اور شدید ترین صورت وہ ہے جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں، جن کی جانب اللہ نے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے ان پر اپنی دعوت و تبلیغ میں سعی بلیغ فرما کر اور حق کی قولی و عملی شہادت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھ کر اتمام حجت کا حق ادا کر دیا۔ اس کے باوجود ان کی قوموں نے بحیثیت مجموعی ان کی دعوت کو رد کر دیا اور حق کی راہ اختیار نہ کی تو ان پر ''عذابِ استیصال'' نازل ہوا۔ یعنی صرف رسولوں اور ان معدودے چند لوگوں کو بچا کر، جو ان پر ایمان لائے، باقی پوری پوری قوموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی یعنی انہیں نیست و نابود اور نسیاً منسیاً کر دیا گیا۔ چنانچہ قرآن کا ہر قاری بخوبی واقف ہے کہ اسی عذاب استیصال یا عذابِ اکبر کی مثالیں ہیں وہ عذاب جو قوم نوحؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ، قوم شعیبؑ اور آلِ فرعون پر نازل ہوئے، جن کے نتیجے میں کہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ ''كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا''، یعنی وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں!'' (سورۂ ھود: ۶۸ اور ۹۵) کہیں فرمایا گیا کہ ''لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمۡ ''، یعنی اب ''ان کے مکانوں اور مسکنوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا'' (سورۃ الاحقاف: ۲۵) یعنی ان کے مکین نیست و نابود ہو گئے! اور کہیں ارساد ہوتا ہے کہ ''فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ''، یعنی ''ان ظالموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی'' (سورۃ الانعام: ۴۵)۔

واضح رہے کہ اس نوع کے عذاب کے ضمن میں قرآن نے ایک سے زائد مرتبہ وضاحت اور صراحت کی ہے کہ یہ کسی رسول کی بعثت کے ذریعے اتمام حجت کے بعد ہی نازل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اسی نوع کے عذاب کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيۡنَ حَتّٰى نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا۝﴾ (آیت: ۱۵)

''اور ہم عذاب بھیجنے والے نہیں ہیں جب تک کسی رسول کو مبعوث نہ کر دیں۔''

اور سورۃ القصص کی آیت ۵۹ میں بھی یہی قاعدۂ کلیہ بیان ہوا کہ:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهۡلِكَ الۡقُرٰى حَتّٰى يَبۡعَثَ فِىۡۤ اُمِّهَا رَسُوۡلًا يَّتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا﴾

''آپ کے رب کی شان یہ نہیں کہ وہ بستیوں کو ہلاک کر دے جب تک ان کے مرکزی مقام پر ایک رسول نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیات سنا دے۔''

اس عذابِ استیصال یا عذابِ اکبر کے ضمن میں اللہ کی یہ سنت بھی قرآن میں بار بار بیان ہوئی ہے کہ جس قوم کی جانب اللہ تعالیٰ رسول کو مبعوث فرماتا تھا اس پر آخری اور بڑے عذاب سے قبل چھوٹے چھوٹے عذاب لوگوں کو جھنجوڑنے کی غرض سے نازل فرماتا تھا، تاکہ جو جاگ سکتے ہوں جاگ جائیں اور جن میں اصلاح پذیری کا مادہ موجود ہو وہ اپنی اصلاح کر لیں۔ چنانچہ اسی سنت الٰہی کا ذکر ہے اختصار کے ساتھ سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ میں:

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝﴾

''اور ہم انہیں لازماً مزہ چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے قبل، شاید کہ یہ رجوع کر لیں۔''

اور اسی کا تفصیلاً ذکر ہے سورۃ الانعام کی آیات ۴۱ تا ۴۵ اور سورۃ الاعراف کی آیات ۹۴ تا ۹۶ میں!

۴) قوموں اور اُمتوں پر بحیثیت اجتماعی اس دنیا ہی میں نازل ہونے والے عذاب الٰہی کی دوسری قسم وہ ہے جو رسولوں کی اُمتوں پر ان کی غلط روی اور بداعمالی کے باعث نازل ہوتا ہے۔ یہ عذاب مقدم الذکر عذابِ استیصال سے اس اعتبار سے ہلکا ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے قوموں یا اُمتوں کا بالکل خاتمہ نہیں ہوتا، لیکن اس اعتبار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے کہ یہ وقفہ وقفہ سے مسلسل آتا رہتا ہے۔ اور جب کوئی مسلمان اُمت اس نوع کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے تو اس پر جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے اسے منفی طور پر بیان کیا جائے تو وہ اس جہنمی انسان کی سی ہوتی ہے جو قرآن کے الفاظ میں ''ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى '' کا مصداق ہو جاتا ہے، یعنی ''نہ وہ زندہ ہی رہتا ہے، نہ اسے موت آتی ہے۔'' اور اگر اسے مثبت طور پر بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ع ''زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا!''

اس قسم کے عذاب کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ جو قوم کسی رسول اور خاص طور پر کسی صاحب کتاب وشریعت رسول کی اُمت ہونے کی مدعی ہوتی ہے وہ گویا زمین پر اللہ کی نمائندہ ہونے کی دعویدار ہوتی ہے۔ اب اگر اس کا طرزِ عمل اور رویہ اس کے دعویٰ کے برعکس ہو، اور وہ اپنے انفرادی اخلاق واعمال اور سیرت وکردار اور اپنی اجتماعی تہذیب وثقافت اور معاشی و سیاسی نظام میں کتاب الٰہی کی تعلیمات اور شریعت خداوندی کے احکام سے مختلف ہی نہیں متضاد نقشہ پیش کرے تو یہ جرم ناقابل معافی ہے، اس لیے کہ اپنے اس طرزِ عمل کے باعث یہ نام نہاد مسلمان اُمت بجائے اس کے کہ خلق اور خالق کے مابین واسطہ (اُمت وسط) اور رابطے کا ذریعہ بنے، الٹی حجاب اور رکاوٹ بن جاتی ہے، اور اس کو دیکھ کر اللہ کے بندے اللہ کے دین کی جانب راغب ہونے کی بجائے الٹے اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصّف کی آیات ۲، ۳ میں فرمایا گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾

''اے ایمان کے دعویدارو! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ تمہارا یہ طرزِ عمل کہ جو زبان سے دعویٰ کرو اس پر عمل میں پورے نہ اترو اللہ کے غضب کو بہت بھڑکانے والا ہے!''

اس نوع کے اجتماعی عذاب میں مبتلا ہونے والی اقوام یا اُمتوں کا ایک وصف مشترک، جسے قسمت کی ستم ظریفی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ وہ اس زعم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم تو اللہ کے بہت چہیتے اور لاڈلے ہیں، اور ہمارا معاملہ دوسرے عام لوگوں کا سا نہیں ہے بلکہ ہم اللہ کے یہاں خصوصی اور ترجیحی سلوک کے مستحق ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس جہل مرکب میں مبتلا قوم پر جیسے جیسے عذاب الٰہی کے کوڑوں کی شدت بڑھتی جاتی ہے اس کے متذکرہ بالا زعم میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، گویا صورت یہ بن جاتی ہے کہ اِدھر درّے پر درّہ پڑتا جاتا ہے، اور اُدھر غرہ پر غرہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی کلاسیکل مثال ہے سابقہ امت مسلمہ یعنی یہود اور نصاریٰ کا یہ قول جو سورۃ المائدہ کی آیت ۱۸ میں نقل ہوا ہے کہ:

﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾

''ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں، اور اس کے نہایت چہیتے اور لاڈلے۔''

جس پر اللہ تعالیٰ نے نہایت عبرت انگیز تبصرہ فرمایا:

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾

''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! ان سے کہئے کہ پھر اللہ تم پر تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں نازل فرما تا رہا ہے؟ تمہارے اس زعم کے برعکس تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے دوسرے جو اللہ نے پیدا فرمائے۔''

اسی طرح ان کا ایک مزعومہ عقیدہ یہ بھی تھا کہ:

﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾

''ہمیں تو (جہنم کی) آگ چھو ہی نہیں سکتی سوائے گنتی کے چند دنوں کے۔''

جس پر نہایت فصیح وبلیغ تبصرہ وارد ہوا:

﴿قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (البقرہ آیت: ۸۰)

''اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے پوچھئے کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے جس کے بارے میں تمہیں وثوق ہے کہ اللہ ہرگز اپنے اس عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا؟ یا تم بغیر کسی علم کے اللہ کی جانب غلط باتیں منسوب کر رہے ہو؟''

اس نوع کے اجتماعی عذاب کے بارے میں یہ قاعدہ کلیہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ ع ''جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے!'' کے مطابق کسی اُمت کو جس قدر بلند درجۂ فضیلت حاصل ہوتا ہے اس کے غلط طرزِ عمل پر عذاب کی شدت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی بھی نہایت نمایاں مثال قرآن حکیم میں سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی یہود ہی کے ضمن میں وارد ہوئی ہے، یعنی ان پر عذابِ الٰہی کی شدت کے بیان کے لیے جو الفاظ سورۃ البقرہ کی آیت ۶۱ میں وارد ہوئے ہیں کہ:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾

''ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔''

ان سے کچھ ہی قبل یہ آیت مبارکہ بھی وارد ہوئی ہے کہ:

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○﴾ (البقرہ:۴۷)

''اے بنی اسرائیل! ذرا یاد کرو میرے ان انعامات واحسانات کو جو میں نے تم پر کئے۔ اور میں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمادی تھی۔''

پھر یہ معاملہ کسی مسلمان اُمت کے مختلف طبقات کا ہے کہ ان میں سے جسے جتنی زیادہ فضیلت حاصل ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ اس کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے، اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کے نتیجے میں اتنی ہی سخت سزا بھی اسے ملتی ہے۔

(۵) مندرجہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ ازخود برآمد ہو جاتا ہے کہ جو قوم نہ کسی رسول کی اُمت ہونے کی مدعی ہو نہ ہی اس کی جانب اس کی یادداشت اور معلوم ومحفوظ تاریخ کی حد تک کوئی رسول مبعوث ہوا ہو، اس کے عذاب وثواب اور جزا وسزا کا سارا معاملہ آخرت سے متعلق ہے۔ حیاتِ دنیوی کی حد تک وہ حیوانات اور چرند وپرند کے مانند اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۰ ''كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ'' اور سورۃ الاحقاف کی آیت ۲۰ ''اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِىْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا'' کے مطابق اللہ کی عطا اور جود وسخا کے دسترخوان سے کھا پی سکتے ہیں، اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی حد تک تو ان پر صرف سپنگلر کے فلسفۂ تاریخ کے مطابق اس قانونِ طبعی ہی کا اطلاق ہوگا کہ جیسے ہر فرد پیدا ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے، پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے، ایسے ہی قومیں اور تہذیبیں بھی مختلف طبعی ادوار سے گذر کر بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ رہا حیاتِ اخروی اور یومِ قیامت کے محاسبہ کا معاملہ تو وہ تو ہر فردِ نوعِ بشر کا اپنے اپنے نظریات وعقائد اور اخلاق واعمال کے اعتبار سے طے ہونا ہی ہے۔

۲۰ اپریل ۱۹۹۳ء

سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں، اور سابقہ اُمت کی دو ہزار سالہ تاریخ کے چار ادوار

قرآنِ حکیم میں ناموں کی صراحت کے ساتھ تو صرف پچیس انبیاء اور رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے، البتہ بعض نبیوں کا تذکرہ بغیر نام لیے بھی وارد ہوا ہے۔ مزید برآں یہ اصولی بات بھی دو مقامات پر بیان ہوئی ہے کہ ایسے بھی بہت سے رسول دنیا میں گزرے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں کیا گیا، (جیسے مثلاً سورۃ النساء کی آیت ۱۶۴ اور سورۂ غافر کی آیت ۷۸ میں)۔ پھر یہ اصول بھی دو ہی مرتبہ ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ''لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ''یعنی ''ہر قوم کے لیے ہادی بھیجے گئے۔'' (سورۃ الرعد آیت:۷) اور ''اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ''یعنی ''کوئی اُمت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ آیا ہو'' (سورۂ فاطر آیت:۲۴)۔ چنانچہ بعض روایات کے مطابق انبیاء کی تعداد اتنی ہی رہی ہے جتنے مسلمان حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے یعنی ایک لاکھ چوبیس ہزار کے لگ بھگ، اور رسولوں کی کل تعداد اتنی تھی جتنی تعداد میں جان نثار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم غزوۂ بدر میں آپؐ کے ہم رکاب تھے، یعنی تین سو تیرہ۔ واللہ اعلم!

اس سے قطع نظر کہ دنیا میں جو رسول مبعوث ہوئے ان کی کل تعداد کتنی ہے اس امر پر تقریباً اجماع ہے کہ ان میں سے پانچ سورۃ الاحقاف کی آیت ۳۵ میں وارد شدہ اصطلاح کے مطابق ''اولوالعزم'' ہیں۔ یعنی حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ چنانچہ ان ہی کا تذکرہ سورۃ الشوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ میں وارد ہوا ہے۔ پھر ان میں سے بھی صرف دو ہیں جنہیں کتاب اور شریعت سے نوازا گیا، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس لیے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ضمن میں تو کسی صحیفے کا ذکر تک کہیں موجود نہیں ہے، ''صحف ابراہیمؑ '' کا ذکر اگرچہ قرآن میں ہے (سورۃ النجم آیت:۳۷ اور سورۃ الاعلیٰ آیت:۱۹)، لیکن غالباً انہیں ''کتاب'' اس لیے نہیں قرار دیا گیا کہ ان میں کوئی شریعت درج نہیں تھی۔ (راقم کو بعض لوگوں کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ ہندوؤں کے ویدوں اور اپنشدوں میں سے بعض صحف ابراہیمؑ کی بگڑی ہوئی اور تحریف شدہ صورتیں ہیں، تاہم ان میں بھی اگرچہ توحید کا بیان تو بلند ترین سطح پر بھی موجود ہے، لیکن احکام اور شریعت کا کوئی وجود نہیں ہے!) اسی طرح زبور اور انجیل کو بھی اگرچہ عرف عام میں کتابیں کہہ دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مستقل بالذات کتابیں نہیں تھیں، بلکہ تورات ہی کے ضمیموں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ چنانچہ زبور صرف حمد اور مناجاتِ باری تعالیٰ کے ترانوں پر مشتمل ہے، اور انجیل صرف حکمت اور موعظت پر! یہی وجہ ہے کہ سورۃ الزخرف کی آیت ۶۳ میں آنجنابؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ ''یعنی ''میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں'' گویا وہ آسمانی کتابیں جن کے ذریعے نوع انسانی کو شریعت خداوندی عطا ہوئی دو ہی ہیں، یعنی اوّلاً تورات جو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت قرار دی گئی (سورۂ بنی اسرائیل آیت:۲ اور سورۃ السجدہ آیت:۲۳) اور ثانیاً قرآن حکیم جو پوری نوع انسانی کے لیے ہدایت ہی نہیں ''الہدیٰ'' قرار پایا۔

چنانچہ صاحب کتاب و شریعت مسلمان امتیں بھی پوری تاریخ انسانی کے دوران دو ہی ہوئی ہیں، یعنی: ایک سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری موجودہ اُمت مسلمہ یعنی امت محمد علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسلام۔ اور چونکہ اس وقت دنیا کے حالات تیزی کے ساتھ جو رخ اختیار کر رہے ہیں اور مستقبل میں جو حوادث و واقعات پیش آنے والے ہیں ان کے ضمن میں ان دونوں امتوں کی باہمی آویزش اور ان کے آخری انجام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس قانونِ عذاب کو فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل ہے جس پر اس سے قبل مفصل گفتگو ہو چکی ہے، لہٰذا ان دونوں کے بعض مشترک اور بعض مابہ الامتیاز خصائص کے علاوہ ان کے ماضی اور حال کا مختصر جائزہ ضروری ہے، تاکہ مستقبل کے بارے میں جو اشارات قرآن حکیم میں وارد ہوئے ہیں اور جو تفصیلی پیشینگوئیاں احادیث نبویہ (علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسلام) میں بیان ہوئی ہیں ان کو صحیح پس منظر میں سمجھا جا سکے۔ اور اس طرح ایک جانب حدیثِ نبوی اور جناب صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیوں کی عظمت اور حقانیت پر دل مطمئن ہو جائیں اور دوسری جانب پیش آنے والے حوادث و واقعات پر ذہن کا ردِّ عمل تحیر اور استعجاب کا نہ ہو، بلکہ وہ ہو جو سرمد کے اس مصرعے میں بیان ہوا کہ: ؏ ''بیا بیا من ترا خوب می شناسم!'' یعنی آؤ کہ میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں!

بنی اسرائیل کی تاریخ کا آغاز اگرچہ ویسے تو لگ بھگ ۱۸۰۰ قبل مسیحؑ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے سے ہوتا ہے، اس لیے کہ انہی کا لقب ''اسرائیل''، یعنی ''اللہ کا بندہ'' تھا اور بنی اسرائیل ان ہی کی اولاد ہیں لیکن ان کو اُمت مسلمہ کی حیثیت تقریباً ۱۴۵۰ ق م میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حاصل ہوئی جب انہیں تورات عطا ہوئی اور ان سے کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامنے اور شریعت خداوندی پر کاربند رہنے کا وہ پختہ عہد و میثاق لیا گیا جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار بہت شدومد سے آتا ہے۔ بہرحال اُس وقت سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک جب خاتم النبیین اور سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، گویا لگ بھگ دو ہزار برس تک، بنی اسرائیل ہی کو اس دنیا میں کتاب الٰہی کی امین اور شریعت خداوندی کی حامل امت مسلمہ کی حیثیت حاصل رہی۔ تا آنکہ ۶۲۴ء میں تحویل قبلہ کو بنی اسرائیل کی معزولی اور نئی اُمت یعنی اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منصب پر فائز کیے جانے کی علامت بنا دیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے تا قیام قیامت اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کتاب و شریعت کی حامل و امین اور روئے ارضی پر اللہ کی نمائندگی کی ذمہ دار ہے۔ کتاب الٰہی کے امین اور شریعت خداوندی کے حامل ہونا بجائے خود ۔

''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!''

کے مصداق ایک بہت بڑا درجۂ فضیلت ہے جو ان دونوں اُمتوں کے مابین قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دو بار یہ آیت مبارکہ سابقہ امت مسلمہ کے ضمن میں وارد ہوئی:

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا۔ اور میں نے تو تمہیں تمام جہانوں (یعنی تمام جہان والوں) پر فضیلت دے دی تھی!''

(سورۃ البقرہ آیات: ۴۷ اور ۱۲۲)

لیکن اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ایک مزید درجۂ فضیلت اس بناء پر حاصل ہے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت اپنے نقطۂ عروج اور درجۂ کمال کو پہنچ کر ختم ہوگئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام سابق انبیاء و رسل کے مانند صرف اپنی اپنی قوموں کی جانب نہیں، بلکہ پوری نوع انسانی کی جانب ہوئی، جیسے کہ فرمایا سورۂ سبا کی آیت ۲۸ میں کہ: ''وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا''، یعنی ''ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!'' لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت گویا اجتماعی طور پر تا قیامِ قیامت فریضۂ رسالت کی امین بھی ہے۔ یعنی اس کی ذمہ داری سابقہ امت مسلمہ کی طرح صرف یہی نہیں ہے کہ خود کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامے رہے اور شریعت خداوندی پر سختی سے کاربند رہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ پوری نوعِ انسانی تک رسالت محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے پیغام کو پہنچانے کا حق ادا کرے اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے غلبے یعنی عالمی سطح پر حکومت الٰہیہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے قیام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اس لیے کہ یہی از روئے قرآن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت ہے۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں تین بار فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق (اسلام) دے کر تا کہ غالب کریں اسے (دین حق کو) پورے کے پورے دین (نظام زندگی) پر۔''

(سورۃ التوبہ آیت: ۳۳، سورۃ الفتح آیت: ۲۸ اور سورۃ الصّف آیت: ۹)

یہی وجہ ہے کہ اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ''اُمت وسط'' بھی قرار دیا گیا جس کا فرض پوری نوع انسانی پر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شہادت یعنی اتمام حجت کا فریضہ ادا کرنا ہے[1] اور ''خیر اُمت''، یعنی بہترین اُمت کا خطاب بھی دیا گیا ''جو پوری نوع انسانی کے لیے برپا کی گئی ہے۔''[2] بقول علامہ اقبال:

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!

[1] ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُـوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (سورۃ البقرہ: ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت (بہترین امت) بنایا، تا کہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر، اور رسول گواہ ہو جائیں تم پر۔''

۲۔ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران ۱۱۰)

''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر پختہ ایمان رکھتے ہو۔''

درجۂ فضیلت کے اس فرق و امتیاز کے ساتھ ساتھ سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کے مابین ایک اور فرق و تفاوت یہ ہے کہ جہاں سابقہ امت مسلمہ ایک ''یک نسلی امت'' تھی وہاں چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی جانب ہے، لہٰذا موجودہ امت مسلمہ ہمہ نسلی اور ہمہ قومی (Multinational) امت ہے۔ مزید برآں درجۂ فضیلت کے اعتبار سے خود یہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے جن کا صراحت کے ساتھ ذکر سورۃ الجمعہ میں کر دیا گیا ہے، یعنی ایک ''امیین'' یعنی بنی اسمٰعیلؑ اور ان کے تابع اہل عرب، اور دوسرے ''آخرین'' یعنی ان کے سوا تمام نسلوں اور جملہ اقوام عالم میں سے ایمان لانے والے مسلمان! اور ان میں سے مقدم الذکر کو ان دو اسباب کی بنا پر بہت بڑا درجۂ فضیلت حاصل ہے کہ (۱) خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی میں سے تھے۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا امیین میں ایک رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان ہی میں سے!''

چنانچہ یہ تو ع ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!'' کے مصداق وہ فضیلت ہے جس پر اہل عرب جتنا ناز کریں کم ہے! اور (۲) یہ کہ اللہ نے ان ہی کی زبان میں اپنا آخری کلام اور نوعِ انسانی کے نام اپنا آخری پیغام نازل فرمایا، جس کا فہم ان کے لیے نہایت آسان ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حامل اُو رحمۃٌ للعالمیں!

یہ پوری بحث اس اعتبار سے تو یقیناً بڑی خوش آئند بھی ہے اور دل پسند بھی کہ ہمیں بحیثیت اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سابقہ اُمت مسلمہ پر بڑی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے اس کا ایک منطقی نتیجہ نہایت تلخ ہے، یعنی اوّلاً ع ''جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے!'' کے عام اور معقول اصول کے مطابق اور ثانیاً خود قرآن حکیم کی اس نص کی رو سے جو سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے خطاب کے ضمن میں وارد ہوئی ہے یعنی: ''یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ'' یعنی ''اے نبی کی گھر والیو! تم عام عورتوں کے مانند نہیں ہو'' (آیت:۳۲) اور ''مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ'' یعنی ''اگر تم میں سے کسی نے کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کیا تو اسے (دوسروں کے مقابلے میں) دگنا عذاب دیا جائے گا'' (آیت:۳۰) یہ ناقابل تردید نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کسی جرم کی جو سزا بنی اسرائیل کو دی گئی اسی جرم کا ارتکاب موجودہ اُمت مسلمہ کرے گی تو اس کے مقابلے میں دوہرے تہرے ہی نہیں بیسیوں گنا عذاب کی مستحق ہوگی۔ اور خود امت مسلمہ میں سے سورۃ النور میں وارد شدہ الفاظ ''والذی تولی کبرہ منھم'' یعنی ''اور وہ جو والی ہوا اس کے سب سے بڑے حصے کا'' (آیت:۱۱) کے مطابق اس عذاب کی شدید ترین صورت کے مستحق مسلمانانِ عالم عرب ہوں گے۔

مندرجہ بالا اصولی نتائج کو ذہن میں جاگزیں کرنے کے بعد اب آیئے کہ پہلے ہم سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی تاریخ کے بعثت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) تک کے دور پر ایک نظر ڈالیں لیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دو ہزار سالہ دور کا وہ خلاصہ جو نئی امت مسلمہ یعنی امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی سبق آموزی اور عبرت پذیری کے لیے کافی تھا کمال فصاحت اور غایت اختصار کے ساتھ قرآن حکیم میں سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی چھ (۲ تا ۷) اور آخری رکوع کی چار (۱۰۱ تا ۱۰۴) یعنی کل دس آیات میں بیان کر دیا گیا ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن حکیم کے نزول کے زمانے تک بنی اسرائیل پر چار دور گزر چکے تھے: دو دور عروج کے جن کے دوران ان کا طرزِ عمل بھی دینی و اخلاقی اعتبار سے درست رہا اور انہیں دنیا میں عزت و سربلندی بھی حاصل رہی اور وہ کثرت اموال و اولاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے بھی بہرہ ور ہوتے رہے...... اور دو ہی دور زوال کے جن کے دوران انہوں نے نفس پرستی اور بغاوت کی روش اختیار کی، جس کے نتیجے میں ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور غیر اقوام کے ہاتھوں وہ خود بھی ذلیل و خوار اور مفتوح و مغلوب ہوئے، اور ان کے دینی و روحانی مرکز یعنی ہیکل سلیمانی کی حرمت بھی پامال ہوئی...... تاہم اگر اس کی کسی قدر وضاحت تاریخی اور زمانی ترتیب کے ساتھ کی جائے تو وہ حسب ذیل ہے:

۱) ان کے پہلے دورِ عروج کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اوّل حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کی فتح سے ہوا اور تقریباً تین سو سال تک نشیب و فراز کے مراحل طے کرتا ہوا یہ دورِ سعادت حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عہد حکومت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا جو تاریخ بنی اسرائیل کے عہد زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲) حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے ساتھ ہی ان کے پہلے دورِ زوال کا آغاز ہوگیا، اس لیے کہ فوراً ہی ان کی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ بہر حال تقریباً تین سو سال ہی میں یہ عہد زوال بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ چنانچہ اوّلاً شمال سے آشوریوں نے شمالی سلطنت اسرائیل کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر ۵۸۷ قبل مسیحؑ میں مشرق (عراق) سے آنے والے بنوقد نضر (بخت نصر) کے حملے نے نہ صرف یہ کہ پوری جنوبی سلطنت یہودیہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا بلکہ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لاکھوں افراد کو قتل کیا، چھ لاکھ یہودی مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہیکل سلیمانی کو کلیتہً مسمار کر دیا حتیٰ کہ اس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں!...... بابل کی لگ بھگ سو سالہ اسیری کا دور بنی اسرائیل کی ذلت و رسوائی کا شدید ترین زمانہ ہے۔

۳) بنی اسرائیل کے دوسرے دورِ عروج کا آغاز بابل کی اسیری سے شہنشاہِ فارس، سائرس یا کیخورس یا ذوالقرنین کے ہاتھوں نجات کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل حضرت عزیر علیہ السلام کی تجدیدی و اصلاحی مساعی سے ہوا، اور دوسری خوشحالی یا سربلندی کا یہ دور بھی لگ بھگ تین سو سال جاری رہا اور اس کا مظہر اعظم وہ مکابی سلطنت تھی جو تقریباً ۱۷۰ ق م سے ۶۷ ق م تک نہایت دبدبہ اور شان و شوکت کی ساتھ قائم رہی اور جس نے ایک بار پھر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) کے دور کی یاد تازہ کر دی۔

۴) بنی اسرائیل کا دوسرا دورِ زوال ۶۳ ق م میں رومی فاتح پومپئی کے ہاتھوں یروشلم کی فتح سے شروع ہوا اور تا حال جاری ہے۔ اس کے دوران ان کی تاریخ میں دوسری بار ان پر عذاب الٰہی کے سخت کوڑے برسے۔ چنانچہ ۷۰ء میں رومی جرنیل ٹائیٹس نے دوبارہ یروشلم شہر اور ہیکل سلیمانی کو مسمار کیا اور ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودیوں کو تہہ تیغ کر ڈالا اور ۶۷ ہزار کو غلام بنا لیا۔ اور اس دن سے جو یہودی اثر و رسوخ سرزمین فلسطین سے ختم ہوا تو لگ بھگ انیس سو برس تک انہیں وہاں سر اُٹھانے کا موقع نہ ملا، بلکہ پورے چھ سو برس تو اس سرزمین میں ان کا داخلہ بھی بند رہا۔ رہا ان کا ہیکل مقدس تو وہ آج تک دوبارہ تعمیر نہ ہوسکا۔ بعد میں رومی شہنشاہ ہیڈریان نے یروشلم شہر کو دوبارہ تعمیر کیا تو اس کا نام بھی یروشلم نہیں ''ایلیا'' رکھا۔

۲۶/اپریل ۱۹۹۳ء

باب چهارم

موجودہ امت مسلمہ کی

چودہ سوسالہ تاریخ کے چارادوار

امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ ما اتٰى على بنى اِسرائيلَ حَذْوَ النَّعلِ بِالنَّعلِ))

''میری اُمت پر بھی لازماً وہ تمام حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر واقع ہوئے، بالکل ایسے ہو بہو جیسے (ایک جوڑے کی) ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔''

اب سے لگ بھگ اٹھارہ برس قبل ان سطور کا راقم مسجد خضراء سمن آباد میں اعتکاف کی حالت میں امت مسلمہ کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ اچانک یہ حدیث مبارک ذہن میں بجلی کی طرح کوند گئی اور اس نے بعینہٖ وہ کام کیا جو ایک بہت بڑے خزانے کو کھولنے کے لیے ایک چھوٹی سی کنجی کرتی ہے۔ چنانچہ فوراً اُمت کی چودہ سوسالہ تاریخ کا ایک خاکہ نوشتۂ دیوار کی طرح نگاہوں کے سامنے آ گیا اور یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کے جن چار ادوار کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدائی چند آیات میں ہوا ہے وہ ایک اعتبار سے ؎

''خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں!''

کے مصداق خود امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ کا پیشگی بیان ہے۔ اس سے جہاں اس حدیث مبارکہ کی عظمت کا نقش دل پر قائم ہوا وہاں اس حدیث نبویؐ کی حقانیت بھی مزید منکشف ہوئی جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

((فِيْهِ نَبَأُ ما قبلكم وخبر ما بعدَ كم وحُكْم ما بَينكم))

''اس میں تم سے پہلے کے لوگوں کے حالات بھی درج ہیں اور تمہارے بعد آنے والوں کے حالات کا ذکر بھی موجود ہے اور تمہارے مابین رونما ہونے والے جملہ نزاعات کا فیصلہ بھی موجود ہے۔''

(ترمذی اور بیہقی عن علیؓ ابن ابی طالب)

بہرحال ذیل میں اُمت مسلمہ کے عروج و زوال کا ایک اجمالی خاکہ تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، تاکہ ایک طرف ''عروج'' کے ضمن میں ملت اسلامی کی عظمت و سطوت گزشتہ کی ایک جھلک سامنے آئے اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا!

مسلمان نوجوان کو معلوم ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبرالٹر (جبل الطارق) سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھی اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی وی آنا کے دروازوں تک جا پہنچی تھیں۔ شاید کہ اسی طرح کچھ نوجوانوں کے دل میں ملت اسلامی کی تجدید اور اس کی عظمت و سطوتِ گزشتہ کی بازیافت کا جذبہ پیدا ہو جائے! ––––– اور دوسری طرف ''زوال'' کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا عدل بے لاگ ہے اور اس کا قانون اٹل اور غیر مبدل۔ اس نے جو معاملہ سابق امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ کیا بعینہٖ وہی ہمارے ساتھ کیا، حتیٰ کہ ہماری اور ان کی تاریخ میں ایک حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے اس پہلو سے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دو دور آئے اور ہم پر بھی دو ہی دور آئے۔ اگرچہ اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وسعت کی نسبت سے ہمارے نکبت و ادبار کے یہ دور بھی یہود کے مقابلے میں بہت طویل رہے اور جس طرح بنی اسرائیل کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ

''اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک!''

کے مصداق دو بار چاک ہوا، اسی طرح ہمارے عہد تولیت میں بھی مسجد اقصیٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

اُمت مسلمہ کے عروج وزوال کے تاریخی خاکے کے ضمن میں دو باتیں پیشگی سمجھ لینی چاہئیں: ایک یہ کہ، جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا چکا ہے، اپنی ہیئت تشکیلی کے اعتبار سے امت محمد علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کے دو حصے ہیں۔ پہلا ''امیین''، یعنی بنی اسماعیل پر مشتمل ہے اور اسے اس امت کے قلب یا مرکز کی حیثیت حاصل ہے اور دوسرا ''آخرین''، یعنی دیگر اقوام پر مشتمل ہے خواہ وہ کرد ہوں یا ترک، اہل فارس ہوں یا اہل ہند، افغان ہوں یا مغل، اہل حبش ہوں یا بربر، شرق بعید یعنی ملایا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغرب بعید یعنی مراکو اور موریطانیہ سے۔

دوسرے یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی عالم اسلام کو تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہئے، یعنی ایک قلب، دوسرے میمنہ اور تیسرے میسرہ۔ اگر دنیا کے نقشے کو سامنے رکھ کر عالم اسلام پر نگاہ جمائی جائے تو وہ ایک ایسے عقاب کے مانند نظر آئے گا جو اپنے دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلائے محو پرواز ہو۔ جزیرہ نمائے عرب، عراق، فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک جو عالم اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں اس عقاب کے جسم کے مانند نظر آئیں گے جن میں سے ایشیائے کوچک کو اس کے سر اور چونچ سے مشابہت ہے اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے کو اس کے دم کے پھیلے ہوئے پروں سے۔ اس عقاب کا دایاں بازو (میمنہ) ایران، ترکستان، افغانستان اور برصغیر ہندو پاک سے ہوتا ہوا ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور بایاں بازو (میسرہ) پورے شمالی افریقہ کو لپیٹ میں لیتا ہوا سپین تک چلا گیا۔

اب آیئے تاریخی خاکے کی طرف:

سن عیسوی کے حساب سے امت مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے، اس لیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ۵۷۱ء میں ہوئی۔ ۶۱۰ء میں آپ ؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور محتاط ترین حساب کے مطابق اپریل ۶۳۲ء میں آپؐ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل فرما کر ''رفیق اعلیٰ'' سے جا ملے، فَصَلّی اللّٰہ علیہ وبارك وسلّم تسلیماً کثیرًا۔ خلفاءِ ثلاثہ یعنی حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت کے دوران ''امیین'' ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر ایک سیلاب کے مانند جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور انہوں نے ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران و عراق، شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں تو یہ عمل رکا رہا لیکن بنوامیہ کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی اس سیلاب نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک طرف مشرق میں ترکستان، افغانستان اور سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ کے علاوہ سپین سمیت مغربی یورپ کا وسیع علاقہ ''امیین'' کے زیر نگیں آ گیا اور عالم اسلام کی سرحدیں تین براعظموں تک وسیع ہو گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عرب افواج اندلس سے پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں۔

آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دور ہے جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالم اسلام کی سیادت دونوں ''امیین'' کی دو اہم شاخوں یعنی بنوامیہ اور بنوعباس کے پاس رہیں اور روئے ارضی کے ایک بڑے حصے پر ان کے دین و مذہب، ان کے تہذیب و تمدن، ان کے علوم و فنون اور ان کی شان و شوکت کا سکہ رواں رہا۔ لیکن جیسے جیسے دنیوی جاہ وجلال میں اضافہ ہوا، جذبات دینی اور حرارت ایمانی میں کمی آتی چلی گئی اور اس طرح یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ اس اندرونی اضمحلال کے اثرات کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت ضرور صرف ہوئی، لیکن دسویں صدی عیسوی ہی کے دوران واضح ہو گیا تھا کہ عرب اپنے عالم پیری میں قدم رکھ چکے ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی کے دوران ''امیین'' کا انحطاط اور زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا اور اس طرح عالم اسلام کے قلب میں قوت کا ایک خلا پیدا ہو گیا۔

خوش قسمتی سے قوت کے دباؤ میں اس کمی کے نتیجے میں عالم اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلب اسلام کی طرف کھنچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے یعنی کرد اور ترکانِ سلجوقی، جنہوں نے گیارھویں صدی عیسوی کے دوران شام، فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اس طرح عالم اسلام کے قلب کی حفاظت اور مدافعت کے لیے کسی قدر تازہ دم قوت فراہم ہو گئی۔

بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے دوران میں امت مسلمہ پر گویا عذابِ خداوندی کے ''وعدہ اولیٰ'' کا ظہور ہوا اور ہو بہو وہی نقشہ کھنچ گیا جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۵ میں تاریخ بنی اسرائیل کے پہلے دورِ عذاب کے ضمن میں آیا ہے۔ چنانچہ پہلے شمال سے صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے اور ۱۰۹۹ء میں نہ صرف یہ کہ مسجد اقصیٰ کے ناموس کا پردہ چاک ہوا، بلکہ بیت المقدس میں وہ قتل عام ہوا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مؤرخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ پورے اٹھاسی برس تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا۔ اس لیے کہ دولت عباسی تو ''مرنے والی امتوں کے عالم پیری'' کا نقشہ پیش کر رہی تھی، گویا ''امیین'' میں تو سرے سے دم خم باقی ہی نہ رہا تھا۔ بالآخر ''آخرین'' کے تازہ و گرم خون نے مجاہد کبیر صلاح الدین ایوبی کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے نجات دلائی اور اس طوفان کا رخ موڑا —— اور پھر مشرق کی جانب سے آیا فتنۂ تاتار کا وہ طوفان

عظیم جس نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور بالآخر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں وہ تباہی مچائی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تہ تیغ ہوئے، بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، اور بعینہٖ وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو کم وبیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے حملے سے بیت المقدس کی ہوئی تھی۔ نتیجتاً زوال ملک مستعصم امیر المؤمنین کے ساتھ ہی خلافِ عباسی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بالکل گل ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ امت مسلمہ پر عذاب خداوندی کا یہ پہلا دور تکمیل کو پہنچا بلکہ کم ازکم ''مبین'' کی حد تک تو وہ وعید بھی پوری ہوگئی جو سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آیت ۳۸ میں وارد ہوئی تھی کہ ''ان تتولوا یستبدل قوما غیرکم''یعنی ''اگر تم پیٹھ موڑ لوگے تو (اللہ) تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو کھڑا کردے گا!'' چنانچہ وہ عالم اسلام کی سیادت وقیادت کے منصب سے معزول کردیئے گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۲۶۰ء میں اس طوفان کا رخ بھی ''آخرین'' ہی نے پھیرا جس سے کم ازکم اسلام کا مغربی بازو اس کی تاخت وتاراج سے محفوظ رہ گیا۔

بارہویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے دوران عالم اسلام کا قلب بعینہٖ وہی نقشہ پیش کررہا تھا جسے دیکھ کر کبھی حضرت عزیر علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ ''أَنَّى يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا''یعنی کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے، اس کی موت کے بعد!'' (البقرہ: ۲۵۹) لیکن پھر امت مسلمہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی وہی شان ظاہر ہوئی جس کا ظہور بنی اسرائیل کے حق میں ہوا تھا صرف اس فرق کے ساتھ کہ چونکہ سابقہ امت مسلمہ ایک ہی نسل پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی نشاۃِ ثانیہ کا یہ عمل بھی لامحالہ اسی نسل کے اندر واقع ہوا، لیکن امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معاملے میں یہ مجبوری نہ تھی، لہٰذا یہاں تجدید ملت کا یہ کام، ''آخرین'' کی مختلف اقوام سے لے لیا گیا۔ چنانچہ ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کے مطابق نہ صرف یہ کہ خود انہی ترکانِ چنگیزی کا بڑا حصہ اسلام لے آیا جن کے ہاتھوں عالم اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی، بلکہ انہی کے قبیل کے وحشی قبائل میں سے دو قبیلوں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور ان میں سے ایک یعنی ترکان تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھ کر عالم اسلام کے دائیں بازو کی توسیع کی اور دوسرے یعنی ترکانِ عثمانی نے ابتداءً ایشیائے کوچک میں قدم جمائے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم الشان مسلمان مملکت کی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف پورے مشرقی یورپ پر اپنی بالادستی کا سکہ جمایا، یہاں تک کہ ایک موقع پر اٹلی کے دروازوں تک پر دستک دی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پورے عالم اسلام کے قلب کی حفاظت وسیادت کی ذمہ داری سنبھالی تا آنکہ خلافت کا بھی احیاء کیا اور اس طرح گویا عالم اسلام کے قلب کی عظمت وسطوتِ گزشتہ پھر پوری طرح لوٹ آئی، اگرچہ عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ ترکوں کے واسطے سے۔

قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ اِدھر تو خلافتِ عثمانی کے استحکام کے ذریعے عالم اسلام کے قلب میں گویا ملت کی نشاۃِ ثانیہ ہوئی اور اُدھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت میں امت مسلمہ پر عذاب الٰہی کے دوسرے اور نہایت طویل دور کا آغاز ہوگیا جس کا اصل زور عالم اسلام کے میسرہ اور میمنہ کی جانب رہا۔

یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں احیاء العلوم کا پورا عمل اسلام ہی کے زیر اثر شروع ہوا اور یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے یورپ کو مشرق ومغرب کے علوم وفنون سے روشناس کرایا۔ لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری ہوئی اور وہاں قوت کا دباؤ بڑھا، گویا عالم اسلام کی شامت آ گئی۔

یورپ مشرق ومغرب دونوں اطراف سے مسلمانوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا، لیکن مشرق میں عذاب کے وعدۂ اولیٰ کے بعد نشاۃِ ثانیہ کا عمل ظاہر ہو چکا تھا اور عظیم سلطنت عثمانیہ عالم اسلام کے قلب کے محافظ سنتری کی حیثیت سے کھڑی تھی، البتہ مغرب میں اب دولت ہسپانیہ ''مرنے والی امتوں کے عالم پیری'' کا نقشہ پیش کررہی تھی۔ لہٰذا ع ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' کے مصداق یورپی استعمار کا اوّلین شکار وہی بنی اور پندرھویں صدی عیسوی کے دوران اس عظیم سلطنت کا قلع قمع ہوگیا۔ یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد تو بعینہٖ وہ صورت پیدا ہوگئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں عذاب استیصال کا نوالہ بننے والی قوموں کے بیان میں کھینچا جاتا ہے یعنی: ''كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا''یعنی ''جیسے کہ وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے'' (سورۂ ہود: ۶۸ اور ۹۵) اور ''لَا يُرٰىٓ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ''یعنی ''اب ان کے ویران مسکنوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا!'' (سورۃ الاحقاف: ۲۵)

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے نیا بحری راستہ تلاش کیا اور اس کے فوراً بعد یورپی استعمار کا سیلاب عالم اسلام کے میمنہ پر ٹوٹ پڑا اور انڈونیشیا، ملایا اور ہندوستان مختلف یورپی اقوام کے استبدادی پنجوں میں جکڑے گئے اور یہ عمل جس کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوا، اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالم اسلام کے دائیں بازو کی حد تک اپنے عروج کو پہنچ گیا۔

اسی اثناء میں دولت عثمانی بھی اپنے شباب کے دور سے گزر آئی تھی اور اب اس نے بھی ''مردِ بیمار'' کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ گویا عالم اسلام کے قلب میں آٹھ صدیوں کے بعد پھر وہی قوت کا خلا پیدا ہوگیا جو گیارہویں صدی عیسوی میں دولت عباسیہ کے اضمحلال کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اور قوت کے دباؤ کی اس کمی کے باعث مغربی استعمار کا رخ عالم اسلام کے قلب کی جانب مڑ گیا۔

عالم اسلام کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے اس دوسرے دور کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کا نیا نقشہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ عظیم دولت عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہو گئی اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالم عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہ راست زیر نگیں ہو گیا یا بالواسطہ محکومی میں آ گیا اور ہو بہو وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس کی خبر مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی تھی کہ: ''يُوشِكُ الْاُمَمُ اَن تَدَاعٰى عَلَيكُم كَمَا تَدَاعَى الاَ كَلَةُ اِلٰى قَصعَتِهَا'' یعنی ''ایک زمانہ آئے گا کہ اقوام عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے (کسی دعوت طعام میں) کھانے والے ایک دوسرے کو دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں۔''

اس طرح بحیثیت مجموعی امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دور ثانی اس صدی کے ربع اوّل میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا جب کہ پورا عالم اسلام مغربی استعمار کے ناپاک شکنجے میں جکڑا گیا، اگرچہ خاص ''امیین'' کی حق میں ''وَعْدُ الْاٰخِرَةِ'' کی وہ مکمل صورت جو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷ میں بیان ہوئی تھی تقریباً نصف صدی بعد ۱۹۶۷ء میں ظاہر ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ایک مغضوب و معلون قوم کے ہاتھوں ایک شرمناک اور ذلت آمیز شکست دلوائی اور عربوں کے عہد تولیت کے دوران ایک بار پھر مسجد اقصیٰ کی حرمت پامال ہوئی اور بیت المقدس ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلا گیا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بار یہ قبضہ کتنا طویل ہو گا۔ اس داستان کا المناک ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے امت مسلمہ کی وحدت ملی کو پارہ پارہ کر دیا اور اس صدی کے آغاز ہی میں نسلی اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بو دیئے جو ابھی تک برگ و بار لا رہے ہیں۔ چنانچہ پہلے انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا، نتیجتاً عالم اسلام کا قلب دولخت ہو گیا اور وحدت ملی کی علامت یعنی خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ پھر عالم عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ نسلی اور لسانی اشتراک کے باوجود عالم عرب کے کامل اتحاد کا امکان تا حال دور دور تک نظر نہیں آتا۔

اسی نسلی تعصب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا مزہ بھی امت مسلمہ کو چکھنا پڑا جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ ''**يلبسكم شيعا و يذيق بعضكم باس بعض**'' یعنی ''تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور پھر چکھائے ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا مزہ'' (سورۃ الانعام: آیت ۶۵)۔ چنانچہ اس صدی کے آغاز میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا اور پھر ۱۹۷۱ء میں بنگالی مسلمان کے ہاتھوں غیر بنگالی مسلمان کے خون کی ہولی اور جان و مال اور عزت و آبرو کی دھجیاں بکھرنے کا منظر چشم فلک نے دیکھا۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ ○

۲۸/اپریل ۱۹۹۳ء

بیسویں صدی عیسوی

سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں

بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بھی تاریخ میں یادگار رہے گی کہ اس کے اوائل میں عظیم سلطنت عثمانیہ کے پرزے اڑ گئے اور اواخر میں عظیم سوویت یونین کی دھجیاں بکھر گئیں، لیکن ہمارے موضوع کے اعتبار سے اہم تر بات یہ ہے کہ اس کے دوران معزول شدہ اور موجودہ مسلم اُمتوں، یعنی یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے ضمن میں دو بالکل مخالف اور متضاد کیفیات کا عمل دخل بالکل اسی شان کے ساتھ جاری رہا جو سورۃ الرحمٰن کی آیات ۱۹۔۲۰ میں بیان ہوئی ہے یعنی ﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ○ ﴾ ''چلائے دو دریا ایک دوسرے سے متصل لیکن ان کے مابین ایک پردہ حائل ہے جس کے باعث وہ ایک دوسرے پر غالب نہیں آ سکتے''—— یعنی ایک جانب ان دونوں پر اللہ کے عذاب کے دورِ ثانی کا وہ سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ بعض اعتبارات سے شدید تر ہو گیا، جو یہودیوں کے معاملے میں تو لگ بھگ دو ہزار برس سے جاری تھا اور مسلمانوں کے معاملے میں بھی کئی صدیوں سے چلا آ رہا تھا، لیکن دوسری جانب ان دونوں ہی امتوں میں ایک احیائی عمل بھی شروع ہوا اور دونوں ہی بعض اعتبارات سے تیزی کے ساتھ ترقی اور عروج کی جانب بڑھتی نظر آئیں۔

واضح رہے کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ کے قانونِ عذاب کی جو تفصیل بیان ہو چکی ہے اس کے مطابق یہودی اب سے لگ بھاگ دو ہزار برس قبل عذاب استیصال کے مستحق ہو چکے تھے، اس لیے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ان کی جانب رسول کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے، جیسے کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ اور سورۃ الصّف کی آیت ۶ میں صراحتاً مذکور ہے، لیکن یہودیوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا انکار کیا، بلکہ ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم صدیقہ سلام علیہا پر بدکاری کا الزام عائد کیا، اور خود آنجناب ؑ کو جادوگری اور ارتداد کے الزامات کے تحت واجب القتل قرار دیا اور اپنے بس پڑتے تو انہیں سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر آپ ؑ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا اور (انجیل برنباس کے مطابق) آپ ؑ کی صورت میں درحقیقت آپ ؑ کے اس غدار حواری یہوداہ اسکریوتی کو سولی چڑھوا دیا جس نے سونے کے تیس سکوں کے عوض مخبری کر کے آپ ؑ کو گرفتار کرایا تھا۔ تاہم ایک خاص حکمت کے تحت (جس کا ذکر بعد میں آئے گا) اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس آخری سزا کی تنفید کو مؤخر رکھا۔ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی آیت ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے موقع پر اللہ نے آپ ؐ کی رحمت للعالمینی کے صدقے یہود کو بھی ایک موقع توبہ کا عنایت فرمایا تھا بفحوائے: ''**عسی ربکم ان یرحمکم وان عدتم عدنا**'' یعنی ''تمہارا رب اب بھی تم پر رحم فرمانے کے لیے آمادہ ہے، لیکن اگر تم نے سابقہ روش برقرار رکھی تو ہم بھی وہی کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں!'' یہ گویا جدید عدالتی اصطلاح میں ایک رحم کی اپیل کا آخری موقع تھا جو یہودیوں نے اپنی سرکشی کے باعث گنوا دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آخری فیصلہ صادر فرما دیا:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ (الاعراف:۱۶۷)

''جب اعلان کر دیا تیرے رب نے کہ وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں بدترین عذاب دیتے رہیں گے۔''

اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کا سب سے نمایاں مظہر اس بیسویں صدی کے وسط میں سامنے آیا جب ہٹلر نے نہ صرف جرمنی بلکہ مشرقی یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو ایسے سپیشل گیس چیمبرز اور ایکسٹرمینیشن پلانٹس کے ذریعے نیست و نابود کیا جن کی نظیر غالباً پوری انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن دوسری جانب یہ معجزہ بھی اسی بیسویں صدی میں ظاہر ہوا کہ جو ملعون و مغضوب قوم دو ہزار برس سے دربدر بھٹک رہی تھی اور کہیں امان نہیں پا رہی تھی اسے دوبارہ اپنے خوابوں کی سرزمین یعنی فلسطین میں پاؤں جمانے کا موقع ملا۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے عربوں سے جو بغاوت ترکوں کے خلاف کرائی تھی، جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ عظیم سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا بلکہ مسلمانانِ عالم کی وحدت ملی کا نشان یعنی خلافت کا ادارہ بھی ختم ہو گیا، اس کا ''انعام'' انہیں حکومت برطانیہ کی جانب سے ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کے ''اعلان بالفور'' کی صورت میں ملا، جس کے نتیجے میں پہلے سرزمین فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری ہوئی اور بالآخر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا خنجر ان کے سینے میں پیوست کر دیا گیا۔ گویا کہ یورپی استعمار کی صورت میں موجودہ اُمت مسلمہ پر اللہ کی جو سزا گزشتہ تین صدیوں سے تدریجاً بڑھ رہی تھی اس کے آخری اور شدید ترین دور کا ''آغاز'' ہو گیا۔ یعنی امت مسلمہ کے افضل ترین حصے، یعنی عربوں پر اللہ کی ایک مغضوب اور معلون قوم کے ہاتھوں ذلت آمیز شکستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی پہلی قسط تو ۱۹۴۸ء ہی میں مل گئی تھی جب انگریزی فوج کے فلسطین سے نکلتے ہی عربوں اور یہودیوں میں جنگ شروع ہو گئی، جس کے نتیجے میں بجائے اس کے کہ یہودیوں کو کوئی نقصان پہنچتا وہ اس رقبے سے بھی زیادہ پر قابض ہو گئے جو انہیں تقسیم کے فیصلے کے تحت ملا تھا۔

''امیین'' پر اللہ کے عذاب کا دوسرا اور شدید تر کوڑا لگ بھگ بیس برس بعد ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں نہایت ذلت آمیز ہی نہیں، حد درجہ شرمناک شکست کی صورت میں پڑا، جس کے نتیجہ میں ۱۹۴۸ء میں قائم ہونے والے اسرائیل نے ''عظیم تر اسرائیل'' کی جانب مزید پیش قدمی کر لی اور مصر و شام اور اردن سے اضافی علاقے ہتھیا لیے......اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مذہبی مرکز یروشلم پر بھی قبضہ حاصل کر لیا۔ ''آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!''

قصہ مختصر، بیسویں صدی عیسوی میں ایک جانب سابقہ اور معزول شدہ اُمت مسلمہ یعنی یہودیوں پر اللہ کے آخری عذابِ استیصال کا ریہرسل یا ٹریلر بھی ''ہالوکاسٹ'' کی صورت میں سامنے آ گیا، اور دوسری طرف ان کے اس آخری عروج کی جانب بھی نمایاں پیش قدمی ہو گئی جس کا کوئی سان گمان بھی ایک صدی قبل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہی معاملہ موجودہ اُمت مسلمہ کے ساتھ پیش آیا کہ جہاں ایک جانب اس صدی کے آغاز میں سلطنت عثمانیہ اور خلافت اسلامی کے خاتمے، اور پھر ۱۹۶۷ء میں عربوں کی عبرتناک ہزیمت اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور ۱۹۷۱ء میں ''آخرین'' کے اہم ترین اور عظیم ترین ملک یعنی پاکستان کی شکست و ریخت اور ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک ہزیمت کی صورت میں عذابِ الٰہی کے سائے مزید گہرے ہو گئے جن پر مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی تھی، وہاں دوسری جانب یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اس صدی کے ربع اوّل کے خاتمے کے لگ بھگ جب اُمت کے ایک حساس اور دردمند فرد کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی یہ دردانگیز صدا ایک تلخ حقیقت کا روپ دھار چکی تھی کہ ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

رحمتِ خداوندی میں جوش آ چکا تھا اور تاریخ بالقوہ ایک کروٹ لے چکی تھی جس کے نتیجے میں پورے عالم اسلام میں ایک احیائی عمل شروع ہو گیا، جس کا کسی قدر تفصیلی جائزہ بہت ضروری ہے تاکہ مایوسی کے سائے زیادہ گہرے نہ ہوں اور حالات کے تاریک رخ کے ساتھ ساتھ روشن پہلو بھی نگاہوں کے سامنے موجود رہے۔

اس احیائی عمل کے بارے میں بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں۔ مثلاً ایک یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرکار ہیں، اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لیے باعث تقویت ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں، بلکہ سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۹: ''لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ'' یعنی ''تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ'' کے مصداق تدریجاً بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا، لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل میں پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اس کی اہمیت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، بقول علامہ اقبال: ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پنہائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔

اس احیائی عمل کا اوّلین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہ راست تسلط سے نجات کا حصول تھا جو بحمداللہ گزشتہ چالیس پچاس سال کے دوران تقریباً مکمل ہو چکا ہے، اور اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوام مغرب کی سائنسی و تکنیکی بالادستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں، تاہم خدا کا شکر ہے کہ ایک قضیۂ فلسطین سے قطع نظر اور صرف کشمیر اور اریٹیریا کے علاوہ پورے کرۂ ارضی پر مسلم اکثریت کا کوئی علاقہ براہ راست غلامی و محکومی کی لعنت میں گرفتار نہیں رہا۔

خالص اصولی و نظریاتی اور تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے تو ''مسلمان اقوام'' کی اصطلاح ہی قطعاً غلط ہے، اس لیے کہ از روئے قرآن و حدیث مسلمانوں کی حیثیت ایک جماعت یا اُمت یا حزب کی ہے نہ کہ قوم کی، لیکن واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک جماعت یا اُمت یا حزب کا کردار تو بہت پہلے ترک کر دیا تھا اور بالفعل ایک قوم ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ البتہ وحدت ملی کا تصور صدی کے آغاز تک برقرار تھا، لیکن اس صدی کے ربع اوّل کے دوران مغربی استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کر کے رکھ دیا تھا اور اس وقت فی الواقع روئے ارضی پر کوئی ایک اُمت مسلمہ آباد نہیں ہے بلکہ بہت سی مسلمان اقوام آباد ہیں۔

اسی طرح خالص تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ع ''نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے'' کے مصداق مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری کا احیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن واقعیت پسندانہ نگاہ سے دیکھیے تو مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی علمبرداری کی سعادت کسی بالکل ہی نئی قوم کے حوالے فرما دے اور ''يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ''، یعنی ''بدل دے تمہاری جگہ کسی اور قوم کو'' (سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان دوبارہ ظاہر ہو...... لیکن بحالات موجودہ تو ع ''کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے'' کے مصداق اسلام کا مستقبل موجودہ مسلمان اقوام ہی کے ساتھ وابستہ ہے اور دونوں باہم لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اندریں حالات مسلمان اقوام کا آزادی وخود مختاری کی نعمت سے ہمکنار ہونا یقیناً احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ مشکل مرحلہ سرہوا ہے ان کی سعی بھی اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہی کی جدوجہد کا جزو قرار پائے گی۔ رہا یہ شبہ کہ ان میں سے اکثر کے قائدین اور زعماء کا دین ومذہب کے ساتھ کوئی واقعی اور عملی تعلق نہ تھا تو اسی کا جواب ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ مبارکہ میں کہ ''اِنَّ اللّٰہَ لیؤیّد ھذا الدِّیْنَ بِالرّجلِ الفاجرِ''، یعنی ''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت غیر متقی انسانوں سے بھی لے لیتا ہے'' (بخاری کتاب الجہاد، عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصول آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لیے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال کیا گیا انہیں بھی خاص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظام فکر کے ساتھ سوائے تضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے، لیکن عالم واقعہ میں اس کے سوائے کوئی چارۂ کار موجود نہ تھا، اس لیے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی وقلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعال تحریک کی اساس بنایا جاسکتا اور حصول استقلال کے لیے جس مؤثر مزاحمت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہوگیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام ونشان بھی صفحۂ ارضی پر موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اِس وقت مسلمانانِ عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں، اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد کے لیے واحد ممکن بنیاد بن سکتا تھا، اور ایک وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس کے استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے، بشرطیکہ اسے نظام فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کرلیا جائے اور حصولِ آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدت ملی کے شعور واحساس کو اجاگر کیا جائے۔

اس پس منظر میں دیکھئے تو تحریک پاکستان کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اگر برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہندی قومیت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے تو اس کے لیے بھی وجہ جواز موجود تھی۔ (چنانچہ جمعیت علماء ہند کی سیاسی جدوجہد اسی اصول پر مبنی تھی، بلکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنی خود نوشت سوانح ''نقشِ حیات'' میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ مسلمانانِ پنجاب کو ''سکھا شاہی'' سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے!) لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات کے باعث مسلمانانِ ہند نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز ''مسلم قومیت'' کی اساس پر کیا، جس کے نتیجے میں وہ ملک وجود میں آیا جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح جو اپنا نام ''سلمان ابن اسلام'' بتایا کرتے تھے، صرف اور صرف ''فرزند اسلام'' قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کے قیام کے لیے کوئی وجہ جواز سوائے اسلام کے موجود نہیں ہے۔ گویا پاکستان ع ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی'' (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مصداق اپنی پیدائش اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے تمام مسلمان ممالک سے ایک قدم آگے ہے۔

مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد کو اس رخ پر ڈالنے والے اسباب وعوامل میں سلبی ومنفی طور پر سب سے زیادہ دخل ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تنگ دلی اور اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لینے کے اس جذبے کو حاصل ہے، جو ان کے سینوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو گویا ان کا یہ طرز عمل بھی اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے مدومعاون بن گیا اور ہم اپنے سابق ابنائے وطن کی خدمت میں جا بجا طور پر عرض کرسکتے ہیں کہ ؎

تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لیے

مثبت اسباب کے ضمن میں ایک تو یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں پہلے بھی جذبۂ ملی باقی تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تنسیخ خلافت پر جس قدر شدید ردّعمل یہاں ظاہر ہوا اس کا عشر عشیر بھی کہیں اور نہیں ہوا، حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی مشترک سیاسی جدوجہد کا عنوان ہی ''تحریک خلافت'' بن گئی تھی...... اور دوسرے یہ کہ اس خطے میں علامہ اقبال مرحوم ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی جس کی انتہائی پُر درد اور پُر تاثیر حدی خوانی نے قافلۂ ملی کو

خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور مسلمانانِ ہند کو جذبۂ ملی سے سرشار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ملی شاعری کو اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کی وسیع الاطراف جدوجہد میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ۱۹۷۴ء میں عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان اور خاص طور پر اس شہر لاہور میں انعقاد بہت معنی خیز تھا، جہاں قریباً نصف صدی قبل قراردادِ پاکستان بھی منظور ہوئی تھی اور جہاں دورِ حاضر میں قافلۂ ملت اسلامیہ کا وہ سب سے بڑا حدی خواں بھی مدفون ہے جو آخری دم تک یہ صدا لگاتا رہا کہ: ؎

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر
دلے در سینۂ ملا گدازیم

اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم کار اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف و مشغول ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برصغیر ہند و پاک کو پورے عالم اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ چنانچہ علماء دین کو جس قدر اثر و رسوخ یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا، اور راسخ العقیدہ اسلام جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا (۶۸ء میں جو ایجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمٰن مرحوم کی کتاب ''اسلام'' کے خلاف ہوا تھا اور پھر ۷۴ء میں جو معجزہ قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا وہ اس کے منہ بولتے ثبوت ہیں) حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب بھی، جہاں اس صدی کے وسط تک محمد ابن عبدالوہابؒ کی تجدیدی مساعی کے گہرے اثرات قائم رہے ہیں اب اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا۔

اس کی وجہ بھی بادنیٰ تأمل سمجھ میں آ جاتی ہے اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سالوں کے دوران میں پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی، اور انہوں نے مسلمانوں کی توجہ علم دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی کی تدوین نو کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجالِ دین کی ساکھ از سر نو مضبوط ہو گئی۔ اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیۓ کہ علماء دین کی مساعی میں اصل زور دورِ حاضر میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے دین کے نظام عقائد و اعمال کی حفاظت و مدافعت پر ہے۔ اس طرح ان کی خدمات کو سابق مجددین اسلام کی مساعی کے ساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت حاصل ہے، اس لیے کہ جملہ مجددین اُمت کی مساعی کی اصل نوعیت بھی احیاء دین یا اقامت دین کی نہیں بلکہ حفاظت و مدافعت دین ہی کی تھی، اور یہ اس لیے کہ ابھی اسلام کا قصر عظیم بالکل زمین بوس نہیں ہوا تھا اور خواہ دین کی حقیقی روح کتنی ہی مضمحل اور پژمردہ ہو چکی ہو، بہرحال اسلام نے جو تہذیبی اور قانونی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار تھا، حتیٰ کہ شریعت اسلامی اکثر مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی۔ چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظام عقائد و اعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی و بیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور تک کے تمام مجددین اُمت علیہم الرحمۃ کی مساعی اکثر و بیشتر علم و فکر کے میدان ہی تک محدود رہیں اور عقائد و نظریات کی تصحیح و اصلاح ہی کو ان کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی، اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاح اخلاق و اعمال، تزکیۂ نفس اور تربیت روحانی تک۔ اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ صدی سے قبل کسی بھی مجدد دین کی جدوجہد نے سیاسی یا عسکری تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔

اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ''خروج''، یعنی مسلح بغاوت پر نہایت سخت بندشیں عائد فرما دی تھیں اور جب تک ان کے ہاتھوں شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہو رہا تھا اور کسی ''کفر بواح''، یعنی کھلے اور صریح کفر کی ترویج و تنفیذ نہیں ہو رہی تھی ان کے ذاتی فسق و فجور اور ظلم و جور کے باوجود ان کے خلافِ مسلح بغاوت ممکن نہ تھی...... یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ صورت حال تبدیل ہوئی اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں آئی، دفعتہً ان مساعی میں عسکریت بھی پیدا ہو گئی، جس کی سب سے شاندار اور تابناک مثال خانوادۂ ولی اللّٰہی کے زیر اثر برپا ہونے والی تحریک شہیدینؒ ہے۔ عالم عرب میں اس کی متوازی تحریکوں کے طور پر مہدی سوڈانیؒ اور شیخ سنوسیؒ کی مساعی کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

البتہ یہ حقیقت پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ عہد حاضر میں بالخصوص برعظیم پاک و ہند میں علماء کرام کی خدمات دو اعتبارات سے اصلاح طلب بھی ہیں: مثلاً ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اور تقلید جامد کا دور دورہ ہوا اور تشتت و انتشار اور فرقہ پرستی و گروہ بندی نے پاؤں جما لیے، ہر فرقے کے علماء کرام دین کے نظام عقائد و اعمال کی خاص اسی صورت کی حفاظت و مدافعت پر سارا زور صرف کر رہے ہیں جو ان کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر و مستند ہے، جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط تر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ دوسرے چونکہ انہوں نے علوم جدیدہ اور دورِ حاضر کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس طرح براہ راست اور بالاستیعاب نہیں کیا جس طرح اپنے اپنے دور میں امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ نے کیا تھا، لہٰذا وہ دورِ حاضر میں حفاظت و مدافعت دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ گویا دورِ حاضر میں علماء دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے والے انجن کی تو نہیں ہے، البتہ کم از کم برعظیم پاک و ہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لنگر کی ضرورت ہے جو اس کشتی کو غلط رخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہر حال سرانجام دے سکتا ہے اور فی زمانہ یہ بھی ایک اہم خدمت ہے۔

برعظیم میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی مکتب فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ''فکر'' کا نہ سہی ''علم'' کا وارث ضرور ہے، اور جس کی کوکھ سے دینی مدرسوں اور دارالعلوموں کے ایک عظیم سلسلے کے علاوہ ایک عظیم تحریک بھی برآمد ہوئی ہے جس نے راسخ العقیدہ اسلام کی جڑوں کی آبیاری کے ساتھ ساتھ توجہات کو حقائق ایمانی پر مرکوز کر دیا، اور جس کے زیر اثر کم از کم ایسے لوگ ضرور دین سے قریب ہو رہے ہیں جن کے اذہان فکری و نظری اشکالات سے خالی ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نیکی کا ایک جذبہ خواہ نیم خوابیدہ حالت ہی میں سہی بہر حال موجود ضرور ہوتا ہے۔ ہماری مراد ''جماعت تبلیغی'' سے ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کے نام پر ایک عظیم حرکت عالم اسلام ہی نہیں، دیارِ غیر میں بھی برپا کر دی ہے، اور جس کے زیر اثر عوامی سطح ہی پر سہی بہر حال ''تجدید ایمان'' کی ایک تحریک بالفعل برپا ہوگئی ہے اور جسے بلا شبہ زیر بحث ہمہ جہتی احیائی عمل میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ حال ہی میں بعض دوسرے مذہبی حلقوں نے بھی اسی طرز پر کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اللہ کرے کہ اس سے فرقہ واریت کو فروغ نہ ہو بلکہ ایمان کی باطنی کیفیات اور شعائر اسلامی کی پابندی کو تقویت حاصل ہو۔

اس ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسر کار ہیں، جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں، لیکن ''ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم'' اور ''ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم''! (جناب نعیم صدیقی) کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی الاخوان المسلمون توجہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برعظیم ہند و پاک ہی کو حاصل ہے۔

برعظیم میں اس تحریک احیائے دین کے مؤسس اوّلین اور داعیٔ اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے، جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے ذریعے ''حکومت الٰہیہ'' کے قیام اور اس کے لیے ایک ''حزب اللہ'' کی تاسیس کی پرزور دعوت پیش کی۔ مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش اور اندازِ خطابت نے، خصوصاً تحریک خلافت کے دوران میں اُن کی شہرت کو برعظیم کے طول و عرض میں پھیلایا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا، لیکن اس کے بعد بعض وجوہ کی بناء پر، جن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے، انہوں نے دفعتہً اس عظیم مشن کو خیر باد کہہ کر انڈین نیشنل کانگرس میں شمولیت اختیار کر لی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کر دی۔ (راقم نے اس موضوع پر مفصل بحث اپنی تالیف ''جماعت شیخ الہندؒ'' میں کی ہے)۔

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تو میدان چھوڑ گئے، لیکن ان کی زوردار دعوت کی گھن گرج سے مسلم انڈیا کی فضائیں دیر تک گونجتی رہیں، اور پھر کم و بیش دس ہی سال بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزم مصمم کے ساتھ ان کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے اسی ''حکومت الٰہیہ'' کے قیام کا نصب العین اور ''تجدید و احیائے دین'' کی سعی کا ایک نقشہ مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا اور پہلے چھ سات برس تک پورے صبر و استقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا۔ پھر کچھ عرصہ ''دارالاسلام'' کے نام سے جو ادارہ علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند چوہدری نیاز علی خاں نے قائم کیا تھا اس کے تحت کام کیا، اور بالآخر ۱۹۴۱ء میں ''جماعت اسلامی'' کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور ایک منظّم جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

سب جانتے ہیں کہ کئی صدیوں سے عالم اسلام میں علمی وثقافتی مراکز دو ہی رہے ہیں، عالم عرب میں مصر اور غیر عرب مسلم دنیا میں ہندوستان۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی کی احیائی تحریکیں بھی ان ہی دو ملکوں سے اٹھیں۔ لیکن تقریباً نصف صدی کے عرصے میں مصر کی تحریک اسلامی کے اثرات تمام عرب ممالک تک پہنچ گئے جن میں کم و بیش بیس پچیس کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اور ہندوستان تو تھا ہی ایک برعظیم جس کے چار ٹکڑوں میں (اس لیے کہ اب کشمیر بھی بالقوہ تو بھارت سے جدا ہو ہی چکا ہے) لگ بھگ چالیس کروڑ مسلمان آباد ہیں، جن کی نوجوان نسل کا معتدبہ حصہ تحریک اسلامی کے زیر اثر آیا ہے۔ ایران کا معاملہ خود اپنی جگہ ایک جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ اس صدی کے آغاز تک وہ باقی مسلم دنیا سے الگ تھلگ گویا اپنے ہی خول میں بند تھا۔ پھر دوسرے ممالک کی احیائی تحریکوں کی فہرست میں ایران کے ''فدائین'' کا بھی ذکر سنائی دیا، لیکن اس کے بعد پھر کچھ خاموشی سی طاری رہی، تا آنکہ اچانک ایک طوفان کی سی کیفیت کے ساتھ ایران میں انقلاب آیا اور وہ بعض اعتبارات سے تو پوری مسلم دنیا سے آگے نکل گیا۔ مزید برآں ان تمام مسلمان ممالک سے جو نوجوان ساٹھ کی دہائی میں حصول تعلیم کے لیے امریکہ، انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک گئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے ان کے ذریعے ان تحریکوں کے اثرات مغربی دنیا میں بھی قابل لحاظ و احساس حد تک پہنچ چکے ہیں، چنانچہ مغرب ان ہی کو ''مسلم فنڈامنٹلسٹ'' کے نام سے پکار رہا ہے اور ان سے اپنی ''مثالی'' تہذیب وتمدن کو خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ (فرعون نے بھی سورۂ طٰہٰ کی آیت ۶۳ کی رو سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو اپنی ''مثالی'' تہذیب کے لیے خطرہ قرار دیا تھا) اور اس امر سے قطع نظر کہ ان تحریکوں کی نصف صدی سے زائد کی مساعی کا حاصل کیا ہے اور پالیسی اور طریق کار کے بارے میں اختلافات کے سبب سے یہ کتنی شاخوں میں تقسیم ہوئی ہیں، جیسے مثلاً عالم عرب میں مصر اور اردن میں بحیثیت مجموعی تو اِخوان نے پُرامن میانہ روی اختیار کی اور سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کو اپنی پیش رفت کا ذریعہ بنایا، لیکن ان ہی سے علیحدگی اختیار کرنے والے زیادہ ریڈیکل عناصر نے تشدد اور دہشت گردی کا راستہ اختیار کر لیا، جیسے مصر کی کچھ عرصہ قبل کی ''التکفیر والہجرہ'' اور حالیہ ''جماعہ اسلامیہ''۔ (اکتوبر ۹۷ء میں راقم نے قاہرہ میں اخوان کے مرشد عمر تلمسانی مرحوم سے ملاقات کی تھی تو انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ ''التکفیر والہجرہ'' اخوان ہی کے لوگ ہیں جو ہم سے علیحدہ ہو کر دہشت گردی کے راستے پر چل نکلے ہیں) اسی طرح اردن ہی کے تقی الدین نبہانی مرحوم نے کہیں زیادہ ریڈیکل ''حزب التحریر'' کی بنیاد رکھی۔ بہرحال یہ امر مسلم ہے کہ یہ تحریکیں مجموعی اعتبار سے عالم اسلام میں احیاء اسلام کی امنگ کا مظہر ہیں اور اب عالمی سطح پر انہیں ایک امر واقعی کی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے۔

الغرض، بیسویں صدی عیسوی میں ایک جانب تو سابقہ اور معزول شدہ اُمت مسلمہ یعنی یہود اور موجودہ امت مسلمہ یعنی مسلمانوں پر عذابِ الٰہی کے کوڑے بھی برستے رہے، لیکن دوسری جانب یہود کی بھی دو ہزار سالہ باسی کڑھی میں اُبال آیا اور وہ صیہونی تحریک کی زیر قیادت ''ارضِ موعود'' میں قدم جما کر عظیم تر اسرائیل کے قیام اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو کی جانب پیش قدمی کے لیے پر تول رہے ہیں، اور خود مسلمان بھی مغربی استعمار کی کم از کم براہِ راست غلامی سے نجات پا کر (اس لیے کہ ابھی ریموٹ کنٹرول بہ تمام وکمال موجود ہے) اپنے دین کے احیاء اور اسلامی نظامِ حیات کے بہمہ وجوہ قیام ہی نہیں، عالمی غلبۂ دین کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اس صدی کی آخری دہائی کے بقیہ حصے میں جو عظیم واقعات وحوادث رونما ہونے والے ہیں ان کی تہہ میں اصلاً ان ہی دو امتوں کی آخری آویزش کارفرما ہو گی۔ اگرچہ اس میں بظاہر زیادہ اہم اور نمایاں کردار ایک تیسری امت ادا کرے گی جو ابراہیمی مذاہب کے ''ثالثُ ثلاثۃ'' یعنی تین میں کے تیسرے کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اس سے قبل کہ مستقبل کے واقعات وحوادث کے بارے میں کچھ بات کی جائے، کسی قدر گفتگو اس تیسری امت کے بارے میں ضروری ہے۔

۵/مئی ۱۹۹۳ء